اس شمارے کی جھلکیاں

مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے قلم سے
- اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے
- ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

ملت کی ایک دردمند اور رہبر شخصیت

"قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ"

ایک مطالعہ---از پروفیسر وصی احمد صدیقی

حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں

مولانا عبداللہ عباس ندوی کی دو کتابوں کی رسم اجراء

از: پروفیسر محسن عثمانی

لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء

قرآن کریم کا چیلنج

قرآن کریم کا چیلنج جس طرح قرآن کے مخاطبین اولین کو دیا گیا تھا اسی طرح بعد میں آنے والے انسانوں کو بھی دیا گیا، اور آج بھی باقی ہے، اور ہر دور میں ایسے دشمنان اسلام بکثرت رہے ہیں، جو اچھی طرح عربی زبان جانتے ہیں، عربی میں اعلیٰ درجہ کی تحریریں لکھتے ہیں، شاعری کرتے ہیں، قرآن کی بخشی ہوئی نحوی تراکیب کو استعمال کرتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ ایسے عیسائی اور یہودی انشاء پرداز بھی ہیں جو اپنی عبارت کو خوبصورت بنانے کے لئے قرآنی آیات اور اس کی خاص نحوی ترکیبوں کو بلا تکلف اپنی عبارت میں سجاتے ہیں جو دیکھنے میں لگتا ہے کہ کانٹوں اور جنگل کے خودرو گھاس کے درمیان ایک حسین اور خوشنما گلاب کھل جائے مگر وہ خود ایک گلاب کے پودے کی تخلیق کرلیں، ناممکن ہے اور قیامت تک ناممکن رہے گا۔

(مولانا عبداللہ عباس ندوی کی نئی تصنیف

"قرآن کریم: تاریخ انسانی کا سب سے بڑا معجزہ" سے ماخوذ)

7/-

Fortnightly

Postal Regd.No.LW/NP/63/2003to2005

Tameer-e-Hayat

R.N.I. No-UP.URD/2001/6071

September, 2003

Nadwatul Ulama, Lucknow-226007

Vol. 2, Issue No. 12

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلیم پر دونئی تصنیفات

عربی زبان میں
فی ظلال السیرة از: مولانا محمد رابع حسنی ندوی
ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

تاریخ تدوین سیرۃ النبی ﷺ از: مولانا عبداللہ عباس ندوی
ناشر: دار العلوم سبیل السلام مدینۃ العلم، حیدر آباد

CHIKAN SQUARE

چکن امپوریم
چکن کپڑے کا شوروم
تقریبات کے موقع پر آپ کی خدمت کے لئے حاضر

Chikan Square

Exclusive Chikan, Party Wear & Handicraft

7, Subhash Marg, Near C.S.M.M.U, Lucknow-3
Ph : 2266491 Mobile 9415025056
e-mail : chikansquare@yahoo.com

Ph. Nos 2260433- 2242946

جدید و دلکش سونے چاندی کے زیورات کے لئے
ہمارے شوروم میں
آپ کا خیر مقدم ہے

گہنہ پیلیس

Gahna Palace

حاجی عبدالرؤف خاں، حاجی محمد فہیم خاں محمد معروف خاں

ایک مینارہ مسجد کے سامنے اکبری گیٹ چوک لکھنؤ

طلباء اور تاجران کتب کے لئے خاص رعایت

تاج
اسلامک جنتری دستیاب ہے

نوٹ: آپ اپنی ضرورت کی کتب بذریعہ ڈاک بھی طلب کر سکتے ہیں۔

تاج بکڈپو، اکبری گیٹ، چوک لکھنؤ

Shop: 2216948
Resi : 2227443

ریڈی میڈ مردانہ ملبوسات کا قابل اعتماد مرکز
اعلیٰ کوالٹی جدید ترین فیشن کے ساتھ

Shirts, Trousers, Coat-Suits,
Embroidered, Sherwanis, Pullowers,
Jackets, Kurta-Suits,
Night Suits, Gowns & Ties.

شادی بیاہ، تیوہار اور تقریبات کے لئے شاندار ذخیرہ تشریف لائیں

men mark®

58, Halwasia Market, Hazrat Ganj, Lucknow

ھردینا

حسنی فارمیسی

چشمہ ساگر

ہمارے یہاں کمپیوٹر کے ذریعہ آنکھوں کی جانچ کی جاتی ہے۔

AUTO REFRECTO METER AR-860

دھوپ کے چشموں کا قابل اعتماد مرکز

ایک بار خدمت کا موقع دیں

آپٹیشین اے۔ رحمن (علیگ)

Editor: Shamsul Haq Nadwi Office Ph 2787250 (Ext.) 18, Guest house 2740151, Fax 91-522-2787310, 2788376

Printed & Published By Athar Husain on behalf of Nadwatul Ulama at Parekh Offset Printing Press, Tagore Marg, Lucknow-20 Ph 2788968

کلام نبوی ﷺ میں دعا و مناجات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو "مغز عبادت" بتلایا ہے، فی الواقع یہ دعا کی بہت عمدہ تعریف ہے، اس لئے کہ دعا ایک ایسا عمل ہے جس کے تمام گوشے اور زاویے روح عبودیت سے معمور ہوتے ہیں، اسی طرح دعا، صاحب دعا کے ذہن و دماغ کو اپنے خالق و پروردگار سے حد درجہ قریب کر دیتی ہے، چنانچہ دعا خواں جب اخلاص و طمانیت کے ساتھ اپنے رب سے محو مناجات ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ اپنے پروردگار کے سامنے جھکا ہوا ہے اور بار بار اسے دیکھے جا رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کی تعبیر کلمہ "احسان" سے فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

"احسان" یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو یہ حقیقت ہی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی یہی کیفیت تھی۔

رہ گئیں آپ کی دعائیں اور مناجاتیں تو وہاں یہ کیفیت قوی ترین شکل میں ظاہر ہوتی تھی، چنانچہ آپ جب مصروف دعا ہوتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا اس جانی پہچانی دنیا سے نکل کر کسی اور دنیا میں تشریف فرما ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو اسلوب و ادا کے لحاظ سے ان قرآنی دعاؤں سے بہت قریب ہیں، جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا تو آپ کی تعلیم کے لیے فرمایا، یا انبیاء سابقین کی دعاؤں کے سیاق میں کیا ہے، آپ کی ان دعاؤں کا جائزہ لیا جائے تو قلب انسانی ان کی قدر و قیمت کے احساس سے معمور اور ان کے زیر اثر پیدا شدہ فضا کی بلندپائیگی سے مسحور ہو جاتا ہے، گویا ایک آواز ہے جو کسی اور دنیا سے آ رہی ہے، جہاں تک ان دعاؤں کے اسلوب اور طرز ادا کا تعلق ہے تو وہ بہت خوبصورت اور لطیف ہے، پُرکار اور سادہ ہے، کبھی چشمۂ صافی کی طرح سبک خرام اور کبھی چٹانوں کے درمیان سے گزرنے والے پُرشور دریا کی مانند تیز گام۔

(مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی تازہ تصنیف "نقوش سیرت" سے ماخوذ)

تعمیر حیات لکھنؤ

جلد نمبر ۴۰ پندرہ روزہ اشاعت کے ۴۰ ویں سال شمارہ نمبر ۱۹

جلد نمبر ۴۰ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء مطابق ۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ شمارہ نمبر ۲۲

زیر سرپرستی:
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نگران خصوصی:
حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی
(معتمد تعلیم، ندوۃ العلماء لکھنؤ)
پروفیسر وصی احمد صدیقی
(معتمد مال، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر عام
مولانا شمس الحق ندوی
معاون
ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

رئیس التحریر
امین الدین شجاع الدین
معاون
محمود حسن حسنی ندوی

مجلس مشاورت
• مولانا نذر الحفیظ ندوی • مولانا عبداللہ حسنی ندوی
• مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

زر تعاون
سالانہ -/۱۵۰ ——— فی شمارہ -/۷
ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک -/۳۵ ڈالر
• ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات لکھنؤ کے نام سے بنائیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
Tameer-e-Hayaat
Post Box No. 93, Nadwatul Ulama Lucknow-226007
فون (دفتر) 2787250 (Ext) 18 مہمان خانہ (0522) 2740151
Website : www.nadwatululama.org
e-mail : Nadwa@sancharnet.in
thetameer-e-hayat@nadwatululama.org

مضامین و مندرجات سے متعلق سارے امور میں رئیس التحریر سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی امور میں مدیر عام سے رجوع کریں۔

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے پاریکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، نیگور مارگ، لکھنؤ میں طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے میں

تعمیر حیات کی فائل سے
• قلب سلیم — حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی ۲

اداریہ
• اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے — حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی ۳

مضامین و مقالات
• اخلاق و اعمال کا فساد — حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ۴
• قرآن کریم - تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ - ایک مطالعہ — پروفیسر وصی احمد صدیقی ۶
• کیا طلاق کا اختیار عدالت کو دینا مناسب ہے؟ — مولانا عتیق احمد بستوی ۹
• عقیدۂ آخرت — مولانا بلال حسنی ندوی ۱۱
• مالابار کا نظام مساجد — ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ۱۲
• ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی — مولانا محمد رابع حسنی ندوی ۱۴
• مولانا آزاد - ایک دور افتادہ صدا — پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۶
• بصائر و عبر — ڈاکٹر نعیم صدیقی (ابوظمی) ۱۹
• یادوں کے دریچے سے — ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۲۱
• عقیقہ سنت ہے — مولانا خالد ندوی غازیپوری ۲۵
• کچھ مدیروں اور رسالوں کے بارے میں — جناب عبدالغنی شیخ ۲۶

متفرقات
• فقہی سوال و جواب — مفتی محمد طارق ندوی ۲۸
• یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — علامہ اقبال

کتاب نما
• حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں دو کتابوں کی تقریب رسم اجراء — پروفیسر محسن عثمانی ۲۹
• تعارف و تبصرہ — مولانا محمود حسن حسنی ندوی ۳۱

آخری صفحہ
• محض تمنا کافی نہیں — امین شجاع ۳۲

دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس شمارہ کے ساتھ آپ کا زر تعاون ختم ہو چکا ہے، از راہ کرم سالانہ زر تعاون ۱۵۰/ روپے ارسال فرما کر ممنون کریں۔

تعمیر حیات کی فائل سے

قلب سلیم

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ

یوم لاینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم

"(یعنی وہ ایسا دن ہوگا) جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، ہاں مگر جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے گا (وہ کامیاب ہوگا)۔

حضرت شیخ الہندؒ "قلب سلیم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایسا دل جو بے روگ ہو یعنی جس دل میں بیماری نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ دل میں بھی روگ ہوتا ہے اور اس کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اور ظاہر ہے کہ جن امراض کا علاج جو شخص جاننے والا ہوگا وہی کرسکتا ہے اور اس کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے گا، ایسے حضرات کی نشاندہی بھی قرآن پاک میں کی گئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے امر کے ساتھ متقیوں اور سچوں کی صحبت میں رہنے کا بھی امر فرمایا تاکہ ان سے تقویٰ حاصل ہو، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔"

حضرت شیخ سہروردی کی خانقاہ میں بہت سے طالبین ٹھہرے ہوئے تھے جو ذکر وشغل میں مشغول رہتے تھے، ایک نوجوان بھی حضرت کی خدمت میں آیا اور حضرت سے تعلق قائم کیا، آپ نے جو ذکر اس کو بتلایا اس میں مشغول رہا اور خلوت میں وہ اللہ اللہ کرتا رہا، اٹھارہ دن کے بعد اس کو بلا کر حضرت نے فرمایا کہ ہم تم کو اجازت دیتے ہیں اب جاؤ اور لوگوں کو دین کی باتیں بتاؤ، گویا اٹھارہ دن میں اس کو خلافت سے مشرف فرمایا اب جو لوگ پہلے سے وہاں مقیم تھے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ہم لوگ برسہا برس سے یہاں پڑے ہوئے ہیں اور یہ نوجوان صرف اٹھارہ دن رہا اس کو خلافت مل گئی حضرت کو ان کا خطرہ منکشف ہوگیا تو حضرت نے ان سب لوگوں کو مع اس نوجوان کے بلایا اور سب کو ایک ایک مرغ اور ایک ایک چھری دے کر فرمایا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کر کے لاؤ جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو، چنانچہ سب لوگ مختلف تنہائی کی جگہوں میں لے جا کر ذبح کر کے لائے اور وہ نوجوان بہت دیر کے بعد زندہ مرغ اور چھری لے کر واپس آگیا لوگ اس کو دیکھ کر ہنسے کہ دیکھو تو سہی یہ کیسا آدمی ہے جس کو کوئی تنہائی کی جگہ ہی نہیں ملی، پھر حضرت نے سب سے دریافت فرمایا کہ تم نے کہاں ذبح کیا؟ تم نے کہاں ذبح کیا؟ سب نے بتادیا، آخر میں اس نوجوان سے پوچھا کہ تم نے مرغ کیوں نہیں ذبح کیا؟ تو اس نے عرض کیا کہ حضور آپ کا حکم یہ تھا کہ ایسی جگہ ذبح کر کے لاؤ جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو تو مجھے کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں کوئی نہ دیکھتا ہو اس لئے کہ جہاں بھی لے گیا اس جگہ یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہے ہیں اس وجہ سے میں اس کو ذبح نہ کرسکا۔

سبحان اللہ! دیکھئے اس نوجوان کو اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا کس قدر استحضار تھا یوں تو اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا عقیدہ ہر مسلمان رکھتا ہے لیکن ہمہ وقت اس کو مستحضر رکھنا، یہ مقام کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے یہی مقام حضور ہے، جو اس نوجوان کو حاصل تھا اور اسی کو مقام احسان کہتے ہیں جس کا ذکر اس حدیث میں ہے کہ "ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ نہ حاصل ہو تو یہ استحضار کرو کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں۔

اہل اللہ کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہر وقت استحضار رکھتے ہیں، اور یہی چیز ان کو معصیت ونافرمانی سے محفوظ رکھتی ہے۔

میرا اپنا ہی ایک شعر ہے۔

معیت گر نہ ہو تیری تو گھبراؤں گلستاں میں
رہے تو ساتھ تو صحرا میں گلشن کا مزہ پاؤں

اللہ کی معیت کا استحضار بہت بڑی نعمت ہے اللہ والوں کو حاصل ہوتی ہے اور اس میں وہ ہر وقت سرشار رہتے ہیں، اور جو لوگ ان کے قریب ہوتے ہیں ان کو بھی اس سے ضرور کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ہے، اس وقت مجھے اپنی ایک غزل کے دو شعر یاد پڑے اس کو پڑھتا ہوں۔

جو ہیں اہل محبت دوستو! پھر ان کا کیا کہنا
محبت کے لئے پھرتے ہیں انگارے محبت میں

یہ ناممکن ہے آئے پاس اور پھر تر نہ ہو جائے
محبت کے اُڑا کرتے ہیں فوارے محبت میں

یہ زندگی بھی اللہ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے جس کو زندگی مل گئی وہ بہت بڑا خوش نصیب ہے، آخرت کی تیاری اسی زندگی میں کی جاتی ہے اور اللہ والے زندگی کے طول کو اسی لئے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں ترقی کا ذریعہ ہے یوں بعضے بزرگوں نے غلبۂ محبت شوق اور محبوب حقیقی سے وصال کی تڑپ میں موت کی تمنا بھی کی ہے اور ایسی موت کی تمنا منع بھی نہیں ہے، بلکہ موت کی وہ تمنا منع ہے جو مصائب وآلام کی وجہ ہو، مگر اعلیٰ وارفع مقام یہ ہے کہ اللہ کے قرب میں ترقی کے لئے زندگی کو غنیمت شمار کرنے، مرنے کے بعد ایک مرتبہ سبحان اللہ یا الحمدللہ کہنے سے جو قرب حاصل ہوتا ہے وہ بھی میسر نہیں ہوگا، اسی بناء پر بہت سے بزرگانِ دین نے آخر عمر میں زیادتی عمر کی تمنا کی ہے۔

چنانچہ علامہ جامیؒ فرماتے ہیں۔

بادو روزہ زندگی جامی نشد سیر غمت
واہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتیم

یعنی دو روز کی زندگی میں جامیؒ آپ کے غم محبت سے سیر نہیں ہوا، کیا خوب ہوتا اگر مجھ کو عمر جاودانی حاصل ہو جاتی۔ ☆

اداریہ

اسلام امن وآشتی کا مذہب ہے

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی

الحمد للہ رب العالمین ، و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد ، و علی آلہ و صحبہ أجمعین ، أما بعد :

مذہبی طبیعت اور مزاج تمام انسانوں کو ملانے والا اور انسانی درد وغم کا مداوا مہیا کرنے والا ایک ذریعہ اور رابطہ ہے، اس طرح کا ذریعہ ورابطہ ہم لوہر مذہب میں محسوس ہوتا ہے، اسلام نے جس کا عنوان سلم یعنی امن سے بنا ہے وہ اس انسانی جذبہ وعمل کو بہت غذا فراہم کرتا ہے، وہ ہر انسان کو اپنے رب واحد سے اپنے تعلق کو ہمہ وقت اپنی نظر میں رکھنے اور اس کے رحم وکرم کی توقع اور طلب کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور رب واحد کو راضی کرنے والے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی منع کی ہوئی باتوں سے پرہیز سکھاتا ہے، اسلام نے انسان تو انسان، جانوروں تک کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کا حکم دیا ہے، اسلام کے رسول برحق اور آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے زور دیکر اس بات کی تلقین کی ہے کہ کمزوروں پر رحم کیا جائے، اور انسان کو انسانی برادری کا ایک باعزت فرد سمجھا جائے، خواہ وہ گورا ہو یا کالا، اور اونچے طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا نیچے طبقہ سے، آقا ہو یا خادم، اور اگر غریب ہے تو زیادہ ہمدردی کے لائق ہے، اور اس میں اللہ رب العزت کی خوشنودی بتائی۔ اسلام نے گذشتہ صدیوں میں اپنی ان خوبیوں کی اور انسانوں کو صحیح راہ پر لانے کی ایک عظیم تاریخ بنائی ہے جو شاندار تاریخ ہے، جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کو تشدد اور دہشت سے جوڑتے ہیں اور اسلام کی انسانی صفات کی یہ تاریخ نہیں دیکھتے وہ اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں، اسلام اپنے ماننے والوں کو سختی اختیار کرنے کی اجازت صرف ایسے موقعوں کے لئے دیتا ہے جن میں ان کے ساتھ یا کسی بھی بے گناہ فرد یا افراد کے ساتھ بے جا ظلم اور دہشت زدہ کرنے کا معاملہ کیا جائے، وہاں صرف اس ظلم کے روکنے کے لئے شدت اور سختی اختیار کرنے کی اجازت ہے، اگر کچھ افراد اس کا غلط اور بیجا استعمال کر لیتے ہیں تو وہ اسلامی عمل نہیں کہلائے گا، بلکہ وہ بیجا عمل ہونے کی بناء پر غلط عمل قرار پائے گا، ایسی غلطی کے صرف وہی لوگ ذمہ دار ہوں گے جو ویسا کریں گے، اسلام کو اس کا الزام دینا صحیح نہیں ہوگا۔

اس وقت دنیا میں خود غرضی اور موقع پرستی اور خاص اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کی حق تلفی اور ان پر ظلم کا چلن بہت بڑھ گیا ہے، اور یہ مقامی اور محدود دائرے سے بڑھ کر وسیع دائرے تک پہونچتا جارہا ہے، اس کو روکنے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کو تکلیف سے بچایا جاسکے، اور انصاف اور اعلیٰ انسانی قدروں کو طاقت پہونچائی جاسکے، اس کی ضرورت کو مذاہب کے ذمہ دار بہت اچھے طریقہ سے سمجھا سکتے ہیں، اور ہماری آزاد حکومتیں اس کے لئے مؤثر عملی طریقے اختیار کرسکتی ہیں۔ اس اکیسویں صدی میں جب کہ انسان تمدن ومادی ترقی میں بام عروج پر پہونچا ہوا ہے، یہی انسان انسانی ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی اور اپنے خالق ومالک رب العالمین کو خوش کرنے کے لئے اعلیٰ انسانی قدروں کو اختیار کرنے سے بہت دور ہوتا چلا جارہا ہے، عوام ہوں یا اصحاب اقتدار، یہ مرض سب میں پھیلتا جارہا ہے۔ ان باتوں کو درست کرنے کے لئے ہم سب کو فکر کرنا چاہئے، اور ہمارے مشرقی ملکوں پر اس کی ذمہ داری زیادہ ہے، کیونکہ ان میں مذہبی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے، اور اس سلسلہ میں ان کی ماضی کی تاریخ بھی اچھی مثالیں رکھتی ہے۔

اسلام میں خاص طور پر اور دیگر تمام مذاہب میں بھی انسانی ہمدردی اور آپسی خیر خواہی اور محبت ورحم دلی کی تعلیمات ملتی ہیں، لہٰذا تمام مذاہب کے لوگوں کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ مقصد سب کا مشترک مقصد ہے۔ ✿✿✿

سخن دلنواز

اخلاق واعمال کا فساد اور اس کے نتائج

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

دنیا میں جس طرح اللہ کا قانون طبعی جاری و ساری ہے ہزاروں برس سے آگ جلاتی ہے، پانی بجھاتا ہے، سنکھیا کام تمام کرتی ہے، تریاق زہر کے اثر کو دور کرتا ہے دوائیں، غذائیں، قوت، تعداد اسلحہ، محنت، تنظیم اور زندگی گزارنے اور کامیابی حاصل کرنے کے آزمودہ اور معروف طریقے بحکم الٰہی اپنا اثر رکھتے ہیں اسی طرح اس کائنات میں ایک اخلاقی قانون مکافات بھی ہے اچھے برے اخلاق و اعمال، افراد اور قوموں کی زندگی میں اپنا اثر اور خاصیتیں رکھتے ہیں، قرآن مجید میں اقوام سابقہ کے تذکرہ میں ان کی تاثیر اور ان کے نتائج کا واضح طریقہ ذکر کیا گیا ہے اور ان افراد اور اقوام کا انجام بتایا گیا ہے، جنھوں نے ان اخلاق و اعمال کا مظاہرہ کیا قوم ہود، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، اور قوم شعیبؑ کا حال دیکھ لینا کافی ہے جن کے خاص امراض و احوال واخلاق (کیرکٹر) کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے ان اعمال، اخلاق کا انجام بتایا گیا ہے حدیث شریف میں خاص خاص اخلاق واعمال کے انجام اور دنیاوی زندگی پر ان کے اثرات اور خاصیتوں کا بہت صاف الفاظ میں تذکرہ ہے کسی پر بے برکتی، کسی پر امراض و پریشانیوں کی کثرت، کسی پر کثرت اموات کسی پر ذلت وخواری اور کسی پر بزدلی و مرعوبیت کا اعلان کیا گیا ہے اس "طب نبوی" کا مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت ضروری اور مفید ہے اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک پر اطلاع دی گئی ہے کہ دعائیں تک مقبول نہ ہوں گی صحیح روایت میں آتا ہے۔

"حضرت حذیفہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے پھر تم اسے پکارو تو تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔"

اس کے برخلاف توبہ وانابت کی عمومی فضا پر آئے ہوئے عذاب کے ٹل جانے کی خبر دی گئی ہے۔

"کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ یقین لاتی پھر کام آیا ان کو ایمان لانا مگر یونس علیہ السلام کی قوم جب یقین لائی کھول دیا ان پر ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں اور کام چلایا ان کا ایک وقت تک۔"

فساد عقیدہ، فساد اعمال و اخلاق کے علاوہ مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد نفاق عملی و اخلاقی میں اور خواص وقائدین کی ایک بڑی تعداد نفاق اعتقادی تک میں مبتلا ہے ایک بڑی تعداد فرائض کی تارک حتی کہ اسلام کے رکن اعظم نماز سے غافل اور مستقل وعلانیہ تارک صلوٰۃ ہے ضرورت ہے کہ تمام سیاسی و اجتماعی تدبیروں کے ساتھ (اور حقیقتاً ان سے پیشتر اور اس سے زیادہ) اصلاح اعمال واخلاق اور فرائض وارکان دین کی پابندی کی دعوت دی جائے اور جزاء الاعمال کے الٰہی قانون کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ ان اخلاقی امراض وعملی فسادات سے ملت کو ڈرایا جائے جو بڑے مہیب اجتماعی وعمومی نتائج رکھتے ہیں اور جن کے لئے قرآن وحدیث میں نص صریح موجود ہے اور بدقسمتی ہے بہت سے مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

شہرت وعزت کا حد سے بڑھتا ہوا شوق اور رسم ورواج کی شریعت کی طرح اور اکثر اس سے زیادہ پابندی

ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی واجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر وفاقہ، اضطرار واضطراب اور ان افسوسناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں فقہ وفتاوی کی محتاط ومحدود زبان اور حلال وحرام کے معین حدود واحکام میں خواہ اس کے لئے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور لرزہ خیز لفظ نہ ملے اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعادل ذات اور ربوبیت ورحمت عامہ کی صفات کے لئے غصہ اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول وزمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں سیکڑوں اور ہزاروں روپئے بے دریغ خرچ کئے جائیں۔

اس سلسلہ کی سب سے زیادہ قابل ملامت و نفرت اور غضب الٰہی بلکہ عذاب الٰہی کو دعوت دینے والی چیز لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ اور فرمائشوں کی وہ فہرست ہے جو لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اس کو رشتہ کی شرط قرار دیا جاتا ہے کہیں اس کو "تلک" کی رسم کہیں "سلامی" اور کہیں "گھوڑے جوڑے" سے تعبیر کیا جاتا ہے لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دینا خلاف شرع وسنت نہیں بلکہ وہ درحقیقت اپنی اولاد کے ساتھ حسن سلوک وصلہ رحمی ہے جو فی نفسہ مباح بلکہ مستحسن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جہیز میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں دیں جس میں ایک خمیل (جھالر دار چادر) ایک مشک ایک تکیہ دیا تھا جس میں گھانس بھری تھی بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے دینے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ کے پاس جن سے شادی ہو رہی تھی روزمرہ کے استعمال کا سامان بھی نہ تھا اس سے ان کے اسباب خانہ داری کی فراہمی کی بھی نیت تھی صحابہ کرامؓ اور ہر طبقہ اور حیثیت کے مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کو ضرورت کا سامان دیا اور یہ اب بھی جائز ومستحسن ہے لیکن اب اس کی شکل بالکل بدل گئی ہے اب نہ ہدیہ مقصود رہا نہ صلہ رحمی بلکہ ناموری شہرت کی طلب اور پابندیٔ رسم رہ گئی ہے اور اس میں بہت سی ایسی پابندیاں شامل ہوگئی ہیں جن کی کوئی شرعی اساس نہیں اس رسم کو پورا کرنے کے لئے لڑکی والے کو اکثر اوقات قرض بھی لینا پڑتا ہے خواہ سود ہی دینا پڑے یا حویلی، باغ اور ضروری املاک فروخت کرنی پڑیں ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں اس کی یہ اہمیت اور اس کا یہ اہتمام نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی معاشرہ کی دین ہے یہ چیز اکثریتی فرقے اور ہندو سماج سے مسلمانوں میں پچھلے دنوں میں آئی ہے اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اس نے شادی کو ایک مصیبت اور دشوار ترین کام بنا دیا ہے اور اس کی وجہ سے ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے اور آرہے ہیں جن سے اس غیرت خداوندی کے حرکت میں آجانے کا خطرہ ہے جس کی بناء پر سلطنتوں معاشرتوں اور تہذیبوں کے چراغ گل اور ملک زیر وزبر کردیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا جو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں فرض تھا کہ ان کی موجودگی میں غیر مسلم معاشرہ میں بھی یہ ظلم عظیم نہ ہوتا جس کی پاداش میں ملک پر قہر الٰہی کے نزول کا اندیشہ ہے اور وہ اپنے کو اس نبیؐ کا وارث ونائب ثابت کرتے جس کے لئے ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ

(سورہ الانفال/۳۳)

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل کرنے والا نہیں ہے، جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں۔"

ملکی معاشرہ میں یہ بیماری کس حد تک پہونچ گئی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور اخبار "قومی آواز" مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"نئی دہلی ۹ر جون مہیلا سرکشا کمیتی کی صدر وممبر پارلیمنٹ مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے کل ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی راجدھانی نئی دہلی میں اب جہیز کے لیے ہر بارہ گھنٹے پر ایک دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے جب کہ اس سے قبل ایک دن میں اس طرح کی ایک موت واقع ہوتی تھی اس سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ جہیز کے خاتمہ کے لئے اعلان تو بہت ہوتے ہیں اور اقدام بھی کیے جاتے ہیں لیکن یہ سب کاغذی معلوم ہوتے ہیں کہ ان سے صورت حال میں بظاہر کوئی سدھار نہیں آیا بلکہ وہ دن بدن ابتر ہوتی جارہی ہے جہیز کا سودا جیسے پہلے ہوتا تھا اب بھی دھڑلے سے ہو رہا ہے اور لڑکی والے جہیز کا بندوبست کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی لاڈلی اولاد کو جلا کر بھسم کر دیا جاتا ہے۔"

ایک دوسرے اخبار "دعوت" دہلی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"گزشتہ سال دہلی میں ۶۱۰ عورتیں جل کر ہلاک ہوگئیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر روز اوسطاً دو عورتیں جل کر ہلاک ہوئیں ان میں سے صرف چالیس عورتوں کی اموات کی وجہ جہیز کے تنازعات بتائی گئی تھی گزشتہ سال جولائی میں جہیز کے تنازعات کی وجہ سے ہونے والی اموات کے مقدمات کی سماعت کے لئے ایڈیشنل سشن جج مسز ڈی جی کپور کو جج مقرر کیا گیا تھا جب سے اب تک ان کی عدالت میں جہیز کی وجہ سے اموات کے صرف گیارہ مقدمات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے چار کی سماعت مکمل ہوگئی ہے اور ان مقدمات میں انہوں نے عمر قید کی سزا سنائی ہے اور ایک ایڈیشنل سشن جج مسز ایس ایم اگروال نے گزشتہ مئی میں جہیز کی وجہ سے ایک عورت کی موت کے مقدمہ میں سزائے موت کا حکم سنایا تھا یہ یقین کرنے کی مناسب وجوہات موجود ہیں کہ جہیز کی وجہ سے اموات کی تعداد درج کئے گئے مقدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔"

لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں یہ مرض داخل ہوگیا ہے اور مسلمان اس کو دینداری بلکہ انسانیت وشرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے اور فہرست میں سے کسی ایک چیز کی تکمیل نہ ہونے پر مہینوں اور بعض اوقات برسوں منکوحہ بیوی یا بہو کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتے ضرورت ہے کہ اس کے خلاف ایک طوفانی مہم چلائی جائے اور مسلمانوں کے دینی شعور اور جذبے کو بیدار کیا جائے اور اس رسم کا بالکلیہ استیصال اور قلع قمع ہوجائے ورنہ اس کے نتیجہ میں کسی بلائے آسمانی یا آفت ناگہانی کے ظاہر ہونے کا خطرہ ہے باقی اس کے جو معاشرتی خاندانی اخلاقی نتائج بد ظاہر ہو رہے ہیں وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں۔

❁❁❁

مولانا عبداللہ عباس ندوی کی دو تازہ تصنیفات

☆ قرآن کریم - تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ

قیمت -/200 روپے

☆ تاریخ تدوین سیرت

قیمت -/100 روپے

ملنے کا پتہ:-

دار العلوم سبیل السلام مدینۃ العلم

Salala, Barkas,

HYDERABAD-500005

(A.P.)

مکتبہ ندویہ، ندوہ، لکھنؤ

”قرآن کریم - تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ“

ایک مطالعہ

مصنف: جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی
پروفیسر وصی احمد صدیقی

اس معرکۃ الآرا کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے میں اس بات کا اعتراف کرلوں کہ عربی زبان کے نہ جاننے کی وجہ سے کلام پاک تک میری رسائی صرف ترجموں کے سبب سے ہے جو انگریزی اور اردو میں میں نے پڑھے ہیں، یقیناً اس کا صوتی حسن، اس کا ترنم، اس کے الفاظ کا تناسب، موزونی اور روانی نے کلام پاک کی تلاوت کرنے والے ایک عام شخص کی طرح مجھ کو بھی متاثر کیا اور اکثر فجر کی نماز میں یا عشاء کی نماز میں جس میں لمبی سورتوں کی تلاوت ہوتی ہے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہوئی کہ یہ سلسلہ دراز رہے اور اس سحر حلال کے اثرات دیر تک قائم رہیں۔

ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ کلام پاک کی تلاوت کرلینا ثواب کی بات ہے، اس کے مفاہیم کو جاننے کی کوشش کرنا واجب ہے اور زیادتی اجر کا باعث بھی لیکن بلاغت کے مرغزار تک پہنچنے کے لئے عربی زبان وادب پر ملکہ تامہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے معانی اور بدیع کے فن پر کامل دستگاہ کی حاجت ہے اور اعلیٰ درجہ کے ذوق کی ضرورت ہے، ان صفات سے یہ حقیر لکھنے والا بالکل مبرا ہے، تھوڑا سا استشنا ذوق والے ٹکڑے کے لئے لیا جاسکتا ہے مگر یہ ذوق صرف حسن سماعت تک محدود ہے ظاہر ہے چڑیوں کی چہچہاہٹ کی کوئی زبان نہیں ہوتی مگر فقط آواز کہہ کر بلبل کو اور فقط رنگ کہہ کر طاؤس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، رنگ تو تصویر کائنات میں مصور ازل نے بھرا ہے جس سے کائنات کا حسن ہے اور آواز تو اس مغنی ازل کی، روح الامین کے ذریعہ سرور کائناتؐ نے سنی کہ ”پڑھ اپنے رب کے نام سے پھر اس آواز کو حضورؐ اس وقت تک سنتے رہے جب تک کہ اللہ نے اپنے حبیب کو اپنے پاس نہیں بلالیا۔

اور اپنے متعلق عرض کروں کہ میں نے کلام پاک میں زمانہ سابقہ کے لوگوں کے حالات پڑھے، قبیلوں کا بادشاہوں کا پیغمبروں کا بزرگوں کا ذکر دیکھا، وہ اخلاقی تعلیم جانی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے اور انعام اور سزا کے مستحق کون لوگ ہوں گے، یہ جانا کہ اس پاک کتاب کے احکامات اور ہدایتیں اسلامی شریعت کے مبارک قوانین بناتی ہیں، یہ احکامات فرد واحد کے لئے بھی ہیں، کنبہ کے لئے بھی اور پورے معاشرہ کے لئے بھی، یہ قوانین انتہائی جامع اور نرمی اور انصاف پر مبنی ہیں، یہ بشری کمزوریوں پر نگاہ رکھتے ہیں، اور ان پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتے جو وہ اٹھا نہ سکیں، یہ کتاب سکھاتی ہے کہ ہمیں گزشتہ پیغمبروں کی پیغمبری کا اقرار کرنا ہے، ان کی کتابوں کا اعتراف کرنا ہے، قیامت کے آنے اور جنت اور جہنم کے وجود پر بھروسہ کرنا ہے، گزشتہ قوموں کی سخت دلی سے بھی عبرت لینی ہے کہ کس طرح انھوں نے نافرمانی کی اور اللہ کا عذاب ان پر نازل ہوا، یہ حدیث عاد وثمود لہو الحدیث نہیں ہے، آدمی کی پہلی نافرمانی اور اس کی پاداش قوم نوح کے گناہوں کی طغیانی، قوم لوط کی بے حیائی اور نافرمانی، فرعون کا جبر اور وہ عذاب جو مینڈک، ٹڈی اور خون کی شکل میں اس کی قوم پر نازل ہوا، حضرت موسیٰؑ کا وطن چھوڑنا اور بنی اسرائیل کا بھٹکنا، حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ان کی قوم کا سلوک غرض یہ سب پڑھا، میں نے عبادت کا طریقہ سیکھا اور زندگی کے آداب جانے، میں نے وراثت کے اصول جانے اور عورتوں کی عزت کرنا سیکھا، ان پر تہمت باندھنے والوں کی عبرت ناک سزا کا فیصلہ پڑھا، غرض کلام پاک کے تاریخ کی کتاب نہ ہونے کے باوجود تاریخ اور زمانہ ماقبل تاریخ سے واقفیت حاصل کی، جغرافیہ کی کتاب نہ ہونے کے باوجود ارض القرآن کا علم حاصل کیا، کہانیوں کی کتاب نہ ہونے کے باوجود وہ دلکش قصے پڑھے جو حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی کا شرماتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے پاس آنے کا تھا کہ چلئے ہمارے باپ آپ کو بلاتے ہیں، اور آٹھ سال کی خدمت کے عوض ان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا، حضرت یوسفؑ کا قصہ پڑھا، دامن کے چاک ہونے اور پھر قید خانہ میں ان کی تقریر سنی کہ ایک اللہ تمہیں بہتر لگتا ہے یا بہت سے رب، وہ خوبصورت قصہ جس کی تفسیر میں مفسرین نے اپنا پورا علم صرف کردیا اور جس کو خود اللہ نے احسن القصص فرمایا ہے اور یہ بات اپنے دل میں بٹھائی کہ ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رحمان اور رحیم ہے، اسی کی عبادت کرنا ہے اور اسی سے مدد مانگنا ہے۔

یہ سب باتیں جو میں نے اپنے لئے لکھی ہیں وہ ایسی باتیں ہیں جن کے لئے علم دین کے بڑے واقف کار ہونے کی ضرورت نہیں، عام مسلمان اس سے واقف ہیں اور ان کے بیان کی اصلاً حاجت نہ تھی مگر مجھے یہ خیال تھا کہ یہ سب تو خود کلام پاک کے معجزات ہیں، کلام پاک کے اثرات کیسے دل ودماغ پر پڑتے ہیں اس سے متعلق واقعات تو بہت جانے بوجھے ہیں، حضرت عمر فاروق کا قرآن پاک سن کر ایمان لانا، عتبہ بن ربیعہ نے جب حضورؐ سے یہ آیت سنی کہ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے، ایسے لوگوں کے لئے نافع ہے جو دانشمند ہیں اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ میں نے ایسی بات سنی ہے جو بخدا زندگی میں پہلے نہیں سنی تھی، بخدا نہ تو یہ شعر ہے نہ جادو کے بول ہیں نہ کسی کاہن کی آواز ہے، کفار کا بڑی شدت سے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنا تو ہر سیرت مبارک کی کتاب میں درج ہے۔

فصاحت اور بلاغت بغیر معنی کے بے معنی ہیں، الفاظ اور معانی جب مل جاتے ہیں تب لفظی اعجاز نمایاں ہوسکتا ہے، ایک بہت بڑے عالم نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اپنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور وہ ہرگز محمدؐ جیسے کسی امی انسان کی تصنیف نہیں ہوسکتا جن کو شعر وخطابت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

یقیناً عربی زبان اور ادب کے واقف کاروں نے لکھا ہے کہ کلام پاک کی زبان اور احادیث مبارکہ کی زبان بالکل الگ ہے مگر پورے ادب سے عرض کرونگا کہ گو شعر کہنا حضورؐ کے شایان شان نہ تھا مگر وہ افصح العرب والعجم تھے اور فن خطابت سے وجدانی طور پر بہرہ مند، ان کی دعائیں پڑھی ہیں، ایسی اثر انگیز دعا جو طائف کو دونوں پہاڑوں کے بیچ میں رگڑ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کو آمادہ کرتی ہے، ان کے خطبات پڑھے ہیں، ایسا خطبہ بھی جو غزوہ حنین کے بعد مال غنیمت کی تقسیم پر کچھ نوجوان انصار کے اظہار رائے پر تھا سوال اور خود ہی جواب کی شکل میں تھا اور جس نے انصار کو زار زار رلایا، یہ وہ خطبہ تھا جو دنیا کے تمام خطبوں پر سرفہرست رکھا جاسکتا ہے، اور دوسرے خطبے جو فصاحت وبلاغت میں حرف آخر ہیں اور پھر حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جس کے پیغام کے لئے حضور نے سارے موجود لوگوں کو گواہ بنایا تھا اور لوگوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ حضورؐ کا آخری خطبہ ہے اور اب حضورؐ رفیق اعلیٰ سے ملنے جارہے ہیں۔

یہ بات برسبیل تذکرہ آگئی، مجھے تو تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے معجزہ پر بات کرنی ہے یعنی جناب مولانا عبداللہ عباس کی کتاب کے مندرجات پر نگاہ ڈالنی ہے، نگاہ اولیں اور مقدمہ لکھنے والے تو خود زبان عربی کے ماہر ہیں، قرآن اور حدیث پر زبردست نگاہ رکھنے والے مگر مصنف کتاب کا بار بار ذکر کرنے اور ان کے بے مثال علم وفضل کے اقرار کے باوجود جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ تقریباً سب ان کے اپنے علم پر مبنی ہیں تو کوئی شک نہیں کتاب کے مندرجات سے ہم آہنگ ہیں مگر ہیں ان کے اپنے۔ یہ لوگ خودداد کے مستحق ہیں، میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کا اول اور آخر سب کتاب ہی سے ماخوذ ہے یہ میرے علمی بساط سے بہت اوپر کی باتیں ہیں اور مجھے اس انگریزی محاورہ کا مصداق بناتے ہیں کہ جس جگہ عقلمند پیر رکھنے سے ڈرتے ہیں وہاں بے عقل گھس پڑتے ہیں۔

کتاب کا پہلا باب معجزہ کی تعریف اور اس کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے، معجزہ اور سحر کے فرق کو بہت واضح کیا ہے، معجزہ کے اصطلاحی مفہوم کے لئے مولانا نے کئی نکات لکھے ہیں مگر حضرت خدیجہ طاہرہؓ نے جس طرح پہلی وحی کے حضورؐ پر اثرات کو دیکھ کر دلاسا دیا تھا وہ بتاتا ہے کہ ان کے لئے خود حضورؐ کی سیرت پاک ایک معجزہ تھی، یہ دلاسا سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

یہاں پر مولانا نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی عبارت نقل کی ہے جو انتہائی پر مغز اور پر اثر ہے انہوں نے فرمایا کہ پیغمبر کا اصلی معجزہ خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، سابقین اولین اور صدیقین اور صالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت ہارون ویوشع نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا بلکہ ان کے سیرت وکردار کا اثر قبول کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہ طاہرہ سب سے پہلے آنحضرتؐ پر ایمان لائیں مگر چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں۔ یہاں مجھے مولانا روم کے دو شعر یاد آتے ہیں۔

در دل ہر کس کہ دانش را مزہ است
روئے و آواز پیغمبر معجزہ است

معجزہ موجب ایمان نہیں، یہ تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہے۔

موجب ایمان نہ باشد معجزات
بوئے جنسیت کند جذب صفات

مصنف کتاب کی ساری کاوش قرآن کریم کے معجزہ کا بیان ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اور جس کی لسانی اور معنوی خوبیاں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے قرآن پاک میں ماضی کی خبروں اور مستقبل کی پیشن گوئیوں کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی میں پیغمبر وقت کی دعوت سے منہ موڑنے والوں کے انجام کا ذکر ہے، نفسیات انسانی کا مکمل جائزہ اور اندرونی کیفیات کو بھی معجزہ کے تحت لائے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ انتہائی باریک بینی کے ساتھ فطرت انسانی کی نقاب کشائی وہی کرسکتا ہے جو فطرت کا خالق ہے اور پھر اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ انسان کو وہ بتایا جو وہ نہیں جانتا تھا، پہلا باب جو بے شمار آیتوں سے مزین ہے اسی اجمال کی تفصیل ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے اس تبین حقیقت کے لئے بھی مولانا نے ۲۶ آیتیں لکھی ہیں، پھر مولانا نے یہ بات بتائی کہ قرآن ساری دنیا اور تمام اقوام عالم کے لئے نازل ہوا اور اس کی وضاحت بھی آیتوں سے کی یہ باب خاصا لمبا ہے اور قرآن پاک کی صرف لسانی صفت کو بیان نہیں کرتا بلکہ معنوی صفات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔

دوسرا باب قرآن کے علوم اور معارف سے متعلق ہے، ان موضوعات کو لیا ہے جو معاندین قرآن پاک کا نقص بتاتے ہیں اور اس طرح نبی کریمؐ کی رسالت پر حملہ کرتے ہیں یہ قرآن میں غیر عربی الفاظ کی موجودگی، اسرار تکرار، اللہ کے لئے متکلم کا صیغہ یا ضمیر واحد اور جمع کا استعمال اور صرفہ پر اعتراض ہیں، مولانا نے ایک ایک اعتراض کا مسکت جواب لکھا ہے، یہ باب گو منطقی ہے اور دلائل سے بھر پور لیکن بے حد دلچسپ ہے، صرفہ کا مطلب معترض حضرات کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن کریم اعجاز بیانی کا نمونہ ضرور ہے لیکن اس

تعمیر حیات کی ڈاک

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا عبداللہ عباس ندوی کی قابل تعریف کتاب جو اعجاز قرآن کے موضوع پر ہے کے جو مختلف ابواب تعمیر حیات میں شائع ہورہے ہیں ان سے دل ودماغ کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ ۲۵ مئی ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں جناب نیاز فتح پوری کے حوالہ سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر مبنی برحقیقت ہے مجھے اپنے تدریسی دور حیات میں اس طرح کے اعتراضات سے اکثر واسطہ پڑتا رہا ہے۔ نیاز صاحب نے تو شیخ سعدی اور مولانا روم کا ذکر کیا ہے میرے طلبہ شیکسپیر یا غالب کا نام لے کر یہی بات کہتے تھے یعنی ان کے کلام کا جواب بھی کون دے سکا ہے جو قرآن مجید ہی کا جواب نہ دے سکنا اس کے معجزے کی دلیل ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبداللہ عباس ندوی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ تو مبنی برحقیقت ہے ہی لیکن میں ان طلبہ سے ایک اور بات کہتا تھا جس کی طرف مولانا نے غالباً توجہ فرمائی ہے۔ شیخ سعدی ہوں یا مولانا روم، شیکسپیر ہوں یا مرزا غالب، ان سب سے پہلے ان کی زبانوں میں ادب وشاعری کی وسیع روایت رہی ہے اور یہ شعراء اپنی اپنی زبان کے ارتقائی مرحلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ اس کے بخلاف قرآن مجید بلاشبہ عربی کی پہلی کتاب ہے۔ عرب میں شاعری کی روایت تو تھی لیکن نثری ادب کی روایت؟ اس تی جو کتبے یا خطبے ملتے ہیں ان کی حیثیت استثنائی ہے اور وہ کسی وسیع روایت کا حصہ نہیں ہیں۔ دوسرے قرآن مجید ایک امی (روحی فداہ) کی زبان پر نازل ہوا ہے۔ یہ فرق اتنا واضح ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص دیانت داری سے یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ جب فلاں فلاں شاعر یا ادیب کا جواب نہیں لکھا جاسکا تو قرآن مجید کا جواب نہ لکھ سکنا اس کے معجزہ ہونے کی دلیل کیسے ہوسکتا ہے۔

نیازمند

(جناب) ریاض الرحمان شیروانی علی گڈھ

طرازیوں کے ساتھ بے مثال شوق اور ذوق کے جذبات شامل ہیں، اس کے مضامین مولانا کے شجر علم کے ثمرات ہیں، مصور تو شکوہ کرسکتا ہیکہ اے میرے محبوب تیرے ناک نقشہ رنگ اور حلیہ کو میں موئے قلم سے کھینچ سکتا ہوں مگر تیرے انداز کو کیسے دکھاؤں، مولانا نے اپنے قلم سے ان کو بھی اجاگر کیا ہے، یہ خصائل نبوی میں آئے ہیں۔

یہ عالم بے بدل، یہ زبان عربی اور ادبیات عربی کے ماہر، یہ علوم دین کے زبردست واقف کار اپنے سینہ میں وہ گداز دل رکھتے ہیں جو عشق رسولؐ میں سرشار ہے، اللہ تعالیٰ مولانا کی اس کاوش کو قبول کرے اور بروز حشر اپنے رسول کے قدموں کے پاس جگہ دے۔ کیونکہ مولانا کا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے اور یہ سب سے بڑا اجر ہے جس کے لئے دعا کرسکتا ہوں۔

اب ختم کرتا ہوں اس آخری بات کے ساتھ کہ ساری تعریفیں اس پروردگار کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

□□□

کاروان رفتگاں

☆ مولانا عبد القادر صاحب ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سمدھی محترم جناب پیرزادہ محمد میاں ظہیر الدین صاحبن کا پٹن گجرات میں انتقال ہوگیا۔

☆ جناب ابوبکر بلاڑی واں بیں نگر بھی وفات پاگئے۔

☆ دارالعلوم کے طالب علم کلام الدین نیپالی کے والد ماجد انتقال فرماگئے۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اعجاز کو قرآن کی بلاغت سے متعلق کرنا صحیح نہیں، مولانا نے اس کو عقلی دلائل اور مثالوں سے رد کیا ہے۔

اب وہ باب آتا ہے جو صفات اور بلاغت کی اعجازی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے، یہاں مولانا نے اپنی ذہانت اور وسعت معلومات کے دریا بہا دیئے ہیں، لسانیاتی اعجاز، خاص اسلوب تعلیم، ابلیس سے مکالمہ کی تفصیل دی اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا قول نقل کیا کہ قرآن کا سب سے بڑا معجزہ اسلام ہے، یہ باب خاص طور پر بہت ادق ہے اور فن بلاغت کو قرآن کا خادم بنا کر پیش کرتا ہے، مشہور محققین کی تحقیقات پر اختصار کے ساتھ بحث کی ہے خاص طور پر ابوعبیدہ کی تاریخی باتیں بیان کی ہیں، فتنہ خلق قرآن، امام احمد ابتلا اور امتحان میں، جاحظ، ابن قتیبہ، ابن المعتز وغیرہ کے کام کا بھی سیر حاصل ذکر ہے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ ادبی صنعت کے ماہر اور الفاظ کے پھول بنانے والے متقدع اور سجع مراعاۃ النظیر کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے والے تو کس شمار وقطار میں ہیں خود کلام اللہ کی قدویت اور حدیث نبوی کی جلالت شان دونوں اپنی جگہوں پر ایک دوسرے سے الگ نظر آئیں گے، رسولؐ کے خطبات میں عبدیت کا جمال اور کلام اللہ میں الوہیت کا کمال نظر آئے گا، جیسے آفتاب کی روشنی اور شفق کی سرخی، یہ تشبیہ میری نگاہ میں اور بہتر ہوتی اگر شفق کی سرخی کے بجائے چاند کی ٹھنڈی روشنی کا ذکر ہوتا، چاند کی روشنی تو سورج ہی سے ملتی ہے، والشمس والقمر سے تو آنکھ اور کان بہت مانوس ہیں۔

پھر مولانا نے حضورؐ کے چند خطبات کو مختصر طور پر لکھا ہے، یہ اس کتاب کا دل کو چھونے والا حصہ ہے، یہ کتاب گو مولانا نے عوام کے لئے لکھی ہے مگر ہے خواص کے لئے، اس میں لکھا ہر باب خود ایک ریسرچ کا موضوع ہوسکتا ہے، یہ کتاب قرآن پاک کے مطالعہ کے لئے ایک اونچی اور معیاری کتاب ہے، فلسفیانہ نکتہ

شریعت اسلامیہ

کیا طلاق کا اختیار عدالت کو دینا مناسب ہے؟

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ ازدواجی رشتہ بہت حساس اور نازک ہے، بیوی سے شوہر کا دل اچاٹ ہونے اور شوہر کے دل میں نفرت کے جذبات مستحکم ہونے کے اسباب اتنے کثیر اور متنوع ہیں کہ ان میں سے اکثر کو عدالت کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا اور کبھی طلاق کے اسباب اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ انھیں عدالت میں زیر بحث لانا عورت کے مفاد میں نہیں ہوتا، بلکہ انھیں راز رکھنا ہی عورت کی بہی خواہی ہوتی ہے، ان اجمالی اشارات کو چند مثالوں سے سمجھئے۔

(۱) فرض کیجئے خالد اور زینب کا آپس میں نکاح ہوا دونوں اپنی جگہ نیک اور شریف ہیں لیکن دونوں کی عادات اور مزاج میں زمین وآسمان کا فرق ہے، مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے دونوں میں معمولی باتوں پر رنجش ہوتی رہی روز روز کی ناچاقی اور رنجش نے نفرت کی شکل اختیار کرلی اب خالد کے دل میں زینب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، ایسی صورت میں خالد زینب سے نکاح ختم کرنا چاہتا ہے، اب اگر وہ عدالت میں جاکر مطالبہ طلاق کی صحیح وجہ بیان کرتا ہے تو عدالت اسے طلاق کی اجازت نہیں دیتی، کیوں کہ عدالت کی نظر میں زینب سے کوئی ایسی نامناسب حرکت سرزد نہیں ہوئی ہے کہ اسے طلاق کا مستحق ٹھہرایا جائے، اب خالد کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ زینب پر غلط الزامات (بدکرداری وغیرہ کے الزامات) لگا کر اور جھوٹے گواہ پیش کرکے اس سے چھٹکارا حاصل کرے، ایسی صورت میں خالد تو سخت گنہ گار ہوگا ہی، دوسری صورت یہ ہے کہ خالد زینب سے آخری درجہ میں بیزار ہونے کے باوجود عدالت کے فیصلہ سے مجبور ہوکر اسے اپنے حبالہ عقد میں رکھے، ظاہر ہے کہ جب خالد کا دل زینب سے اچاٹ ہوچکا ہے اور اس کے دل میں نفرت کے جذبات مستحکم ہوچکے ہیں تو وہ زینب کے ازدواجی حقوق کیا ادا کرپائے گا، ممکن ہے کہ وہ خدا کے خوف سے یا قانون کے ڈر سے زینب کا نان نفقہ دیتا رہے لیکن زینب کو خالد کے گھر میں وہ محبت ویگانگت کہاں ملے گی جس کی اہمیت اور ضرورت نان نفقہ سے کہیں زیادہ ہے۔

(۲) شوہر، بیوی کے بارے میں حد درجہ غیور ہوتا ہے، فرض کیجئے اسے اپنی بیوی کے بارے میں بد کرداری کی شکایت ہے، شوہر کی بار بار کی تنبیہ اور سرزنش کے باوجود بیوی اپنی اصلاح نہیں کرسکی اور عادت بد میں مبتلا ہے، شوہر نے مجبوراً رشتہ نکاح توڑنے کا فیصلہ کیا اگر شوہر کو تنہا طلاق دینے کا اختیار ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ طلاق دے کر بیوی کو رخصت کردیتا، اس طرح شوہر راحت کی سانس لیتا اور بیوی کا رسوا کن راز افشانہ ہوتا، ممکن ہے کہ وہ بدچلنی سے توبہ کرکے کسی دوسرے شخص کی زوجیت میں آجاتی، لیکن طلاق کا اختیار کورٹ کو دینے کے بعد میاں بیوی کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں، اگر شوہر عدالت میں جاکر صحیح صورت حال بیان کرکے طلاق کا مطالبہ کرتا ہے تو عورت جج کے فیصلہ سے پہلے ہی اخلاقی اور سماجی موت مرچکی ہوتی ہے، اس کی حیثیت عرفی بری طرح مجروح ہوجاتی ہے۔ (خواہ اسے عدالت الزام سے بری کردے) وہ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتی، خدانخواستہ کہیں اگر یہ کیس وکیلوں اور صحافیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو الامان والحفیظ۔

ظاہر ہے کہ اگر فرضی واقعات نہ گڑھے جائیں اور جھوٹے گواہ نہ کھڑے کئے جائیں تو بدکرداری کا دعویٰ ثابت کرنا آسان نہیں ہے لہٰذا شوہر نے اگر سچائی ہی پر اکتفا کیا تو وہ اپنا دعویٰ ثابت نہیں کرسکے گا اور اسے طلاق دینے کا حق عدالت سے نہ مل سکے گا، ایسی صورت میں وہ بیوی کے ساتھ ازدواجی رشتہ کے تقاضوں کو کس طرح برت سکتا ہے؟ قانوناً خواہ دونوں کا نکاح باقی رہے لیکن عملاً دونوں بے نکاح کی طرح بلکہ اس سے بدتر رہیں گے، خصوصاً عورت بڑی مصیبت میں گرفتار رہے گی۔ اس طرح کے واقعات میں بہت سے غیرت دار اور شریف شوہر اپنے خاندان کی بدنامی کے خوف سے عدالت میں مقدمہ لے ہی نہیں جاتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہتے ہیں، رشتہ نکاح ان کے لئے نعمت اور رحمت بننے کے بجائے شدید ترین ذہنی، نفسیاتی اور مالی عذاب بن جاتا ہے۔

عدالت کا اختیار طلاق اور شرح طلاق

طلاق کا اختیار عدالت کے ہاتھ میں دینے سے طلاق کے واقعات میں کمی یا اضافہ کا انحصار اس بات پر ہے کہ قانون میں اسباب طلاق کا دائرہ خوب وسیع کیا گیا ہے یا انتہائی تنگ رکھا گیا ہے، جن ممالک میں اسباب طلاق کا دائرہ خصوصاً عورت کے تعلق سے کافی وسیع رکھا گیا ہے وہاں عدالت کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار دینے سے طلاق کی شرح گھٹنے کے بجائے کافی بڑھی ہے، بیوی کو کسی بات پر شوہر سے شدید ناراضگی ہوئی، شدید وقتی تاثر سے مغلوب ہوکر اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ شوہر کے ساتھ میرا نباہ نہیں ہوسکتا اس نے عدالت میں فسخ نکاح کا دعویٰ کردیا، عدالت کی نگاہ میں اتنی بات نکاح ختم کرنے کے لئے کافی ہے کہ عورت کسی حال میں شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہے، جج نے نکاح ختم کردیا کیوں کہ عدالت کی نگاہ میں بیوی کا نکاح ختم کرنے پر اصرار اسے شوہر کی جانب سے کوئی زبردست اذیت پہنچنے ہی کی وجہ سے ہوگا، خواہ عورت اسے ثابت نہ کرسکی ہو، عورت کو ہر حال میں مظلوم قرار دیئے جانے کا موجودہ تصور اس طرح کی قانون سازی اور عدالتی کاروائی کا سبب ہے، اس کے نتیجے میں بسا اوقات شوہر اور بچوں کے جائز مفادات بری طرح متاثر ہوتے ہیں خصوصاً شوہر کا زبردست مالی اور خاندانی نقصان ہوتا ہے، بسا اوقات عورت کے سر سے وقتی غصہ اور عجلت پسندانہ فیصلہ کا نشہ اترنے کے بعد اسے بھی اپنے عاجلانہ اقدام پر غیر معمولی ندامت ہوتی ہے لیکن شوہر ماضی کے تجربہ سے سبق حاصل کرکے اس عورت کو دوبارہ اپنے

نکاح میں لینے کا خطرہ نہیں مول لینا چاہتا۔

اسباب طلاق کا دائرہ وسیع تر کرنے کی وجہ سے بہت سے مغربی ممالک میں نکاح طلاق کھیل تماشہ بن کر رہ گئے ہیں، ازدواجی رشتہ انتہائی ناپائیدار ہوگیا ہے، طلاق کی شرح حیرت انگیز رفتار سے بڑھ رہی ہے، روز روز کے نکاح وطلاق سے سب سے بڑا نقصان ان بچے بچیوں کا ہو رہا ہے جو ماں باپ کی وقتی لطف اندوزی کے نتیجہ میں عالم وجود میں آتے ہیں، ماں باپ کی محبت اور تربیت سے محروم ہو کر وہ بچے کندونا تراش کی طرح زندگی گذارتے ہیں، طرح طرح کے امراض، بری عادات اور نفسیاتی وذہنی الجھنوں کے شکار ہوتے ہیں، خواہ حکومت ان کی غذا دوا اور تعلیم وتربیت کے کتنے اعلیٰ انتظامات کردے، ماں باپ کی محبت اور خاندانی تربیت سے محروم بچے جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے سماج کے لئے زبردست خطرہ بنتے جارہے ہیں۔ یہ بچے بڑی آسانی سے جرائم پیشہ گروہوں کے چنگل میں آجاتے ہیں، منشیات اور بری عادات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، انکی بہترین صلاحیتیں ملک کی تعمیر وترقی کے بجائے تخریبی کارروائیوں اور جرائم میں صرف ہوتی ہیں۔

عدالت کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار سونپنے کے بعد اگر اسباب طلاق کا دائرہ قانونی طور پر انتہائی محدود رکھا جاتا ہے تو دوسری طرح کے سنگین مسائل پیدا ہوتے ہیں اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے شرح طلاق میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، مثلاً اگر شوہر کو طلاق کا اختیار عدالت صرف اس صورت میں دیتی ہے جب شوہر عدالت میں بیوی کی بدکرداری یا اسی طرح کے کسی اور سنگین جرم کا ثبوت پیش کرے، اب اگر بیوی نے واقعتاً ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اس کا علم اور مشاہدہ صرف شوہر کو ہے کیوں کہ اس طرح کے جرائم عموماً بہت تنہائی میں انتہائی رازداری کے ساتھ کئے جاتے ہیں تو سچے گواہ کہاں سے پیش کرے، پھر اس طرح کے اسباب طلاق کو عدالت میں زیر بحث لانا، وکیلوں اور ججوں کو بال کی کھال نکالنے کا موقع دینا کہاں تک عورت اور سماج کے مفاد میں ہے؟ پھر ہمارے ذرائع ابلاغ (میڈیا) ایسے سنسنی خیز رومانٹک مقدمات میں دلچسپی لے کر اپنا فروغ چاہتے ہیں۔ وہ ان سنہرے مواقع سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں گے، بہرحال عدالت کا فیصلہ جو بھی ہو بیچاری عورت تو خاندان اور سماج میں منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوگی اور اگر بیوی نے بدکاری یا کسی ایسے سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے جس کی بنا پر شوہر کو قانونی طور پر طلاق دینے کا حق ہے لیکن بیوی کی چھوٹی چھوٹی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے یا مزاج اور عادات میں عدم یکسانیت اور تضاد کی وجہ سے شوہر کے دل ودماغ میں بیوی کی تئیں نفرت بیٹھ چکی ہے اور اس کا دل کسی طرح بیوی کی طرف مائل نہیں ہوتا ایسی صورت میں شوہر کے سامنے دو ہی راستے ہیں اگر وہ یہ طے کرتا ہے کہ مجھے جھوٹ نہیں بولنا ہے اور جھوٹا مقدمہ نہیں قائم کرنا ہے تو یا تو وہ عدالت میں جائے گا نہیں اور اگر جائے گا تو ناکام ہوگا، ایسی صورت میں قانونی طور پر نکاح باقی رہے گا لیکن دونوں کے لئے فرحت وانبساط اور خوش گوار عائلی زندگی کا سبب بننے کے بجائے مصیبت اور سوہان روح بنے گا، روز روز کی کشیدگی اور خانہ جنگی سے خاندان اور سماج بھی تنگ ہوجائے گا، ایسا شوہر جس کے دل میں بیوی کے تئیں نفرت اور عداوت کے جذبات مستحکم ہوچکے ہوں ہوسکتا ہے کہ قانون کے ڈر سے بیوی کو نان نفقہ مہیا کردے لیکن وہ بیوی کو الفت ومحبت اور جنسی آسودگی کہاں سے دے سکتا ہے جب کہ اس کے دل ودماغ میں نفرت کے جذبات موجزن ہیں، ایسی صورت میں نکاح کا باقی رکھا جانا نہ ان دونوں کے حق میں ہے نہ سماج کے مفاد میں، خصوصاً اگر دونوں نوجوان ہیں تو بہت سے مفاسد کا خطرہ ہے، یا تو دونوں اپنی جنسی جذبات کا مسلسل خون کرتے رہیں یا جذبات کے سیل میں بہہ کر جنسی آسودگی کے ناجائز راستے تلاش کریں اور اپنی عصمت وعفت چاک چاک کریں۔

اور اگر شوہر نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنی ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے خواہ مجھے کچھ بھی کر گزرنا پڑے تو معاملہ پہلی صورت سے بھی زیادہ سنگین ہوجاتا ہے، شوہر وکیلوں کے مشورہ سے بیوی پر بدکاری اور اس طرح کے دوسرے سنگین الزامات لگا کر طلاق کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے ان جھوٹے اور فرضی الزامات پر جھوٹے گواہ اور جعلی دستاویزات پیش کرتا ہے، اس دور میں جب کہ سماج سے مذہبی اور اخلاقی تعلیمات تیزی سے رخصت ہوتی جارہی ہیں اور دولت نے معبود کا مقام حاصل کرلیا ہے اور ہمارے بہت سے ذہین ترین وکلاء اور قانون دانوں کی بہترین دماغی صلاحیتیں گراں قدر فیس پر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہیں شوہر کے لئے سنگین جھوٹے الزامات کو عدالت میں ثابت کرنے کے لئے مشاق گواہوں اور ماہر قانون دانوں کی خدمات حاصل کرلینا کچھ مشکل نہیں، پھر عدالت کا فیصلہ جو بھی ہو شوہر کے بدترین الزامات نے عورت کا مستقبل تو تباہ کر ہی دیا، اس کا کردار سماج اور خاندان کی نظر میں مشکوک ہو ہی گیا، عورت کا اس سے بڑا نقصان کیا ہوسکتا ہے۔

اگر جھوٹا مقدمہ قائم کرکے شوہر کو ناپسندیدہ بیوی سے نجات کی امید نہیں ہوتی تو شوہر دوسرے مجرمانہ طریقے اختیار کرتا ہے، خدا جانے کتنی بے گناہ عورتیں دنیا کے مختلف ممالک میں اس لئے ماری یا جلائی جاچکی ہیں کہ ان کے شوہران سے نفرت کرتے تھے اور طلاق دینے کا راستہ قانونی طور پر ان کے لئے بند تھا، انھوں نے اپنی بیویوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی حادثہ کے پردے میں ان کی جان لے لی خود ہمارے ملک میں عورتوں کو مارنے اور جلانے کے جو واقعات پریس میں آتے رہتے ہیں، ان میں جہیز اور تلک کے مطالبات کے علاوہ بہت سے واقعات میں ان ناپسندیدہ بیویوں سے نجات کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جن سے رہائی عدالت کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتی، اب یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ سو (۱۰۰) عورتوں کا مطلقہ ہونا زیادہ فکرمندی اور تشویش کی بات ہے یا پچاس عورتوں کا قتل کیا جانا اور جلایا جانا؟

❁❁❁

تعلیم الحدیث

عقیدہ آخرت

مولانا بلال عبدالحی حسنی

ہر ذی ہوش انسان جب کوئی چھوٹا یا بڑا کام کرتا ہے تو اس کے سامنے کچھ مقاصد ہوتے ہیں جو اس کے لئے قوت محرکہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یہی مقصدیت اس کے اندر تموج پیدا کرتی ہے، اور یہ بات بھی انسانی نفسیات میں داخل ہے کہ وہ ہر کام سے پہلے اور اس کے بعد نتائج پر غور کرتا ہے، اسی سے اس کے عمل میں نمو ہے، اور ان ہی نتائج وثمرات کو سامنے رکھ کر یا ان کو معلوم کرکے وہ عمل میں تبدیلی لاتا ہے، اسی سے اس کے اندر قوت عمل پیدا ہوتی ہے، یہ وہ گردش لیل ونہار ہے جو جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔

معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری انسانیت کے سامنے یہ حقیقت واشگاف کردی ہے ہر انسانی عمل کا اصل محور آخرت کی جزاء یا سزا ہے، اگر اس نے خیر کا عمل کیا ہے تو اس کی جزاء پائے گا اور اگر اس نے کوئی برا عمل کیا ہے تو اس کا نتیجہ بھی اس کے مطابق ہی وہ دیکھے گا۔

جزاء وسزا کا یہ تصور ہی انسان کی زندگی میں شفافیت پیدا کرتا ہے اور اس کے عمل میں نکھار لاتا ہے، اسی کے تصور سے اس کے اندر برائیوں سے وحشت پیدا ہوتی، اور خیر کی طرف وہ راغب ہوتا ہے، اس کا خیال جتنا غالب ہوتا جاتا ہے، آدمی کی زندگی میں نکھار آتا جاتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخرت کا یقین ایک عام انسان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جو بڑے بڑے عارفین اور اولیاء اللہ کا مقام ہے، اس یقین کے اندر ایسی طاقت ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، انسان کی اندر جب یہ استحضار پیدا ہوجاتا ہے کہ ہمیں مرنا ہے، اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، اپنے کئے کا بدلہ پانا ہے، تو بڑے سے بڑا عشرت کا سامان بھی اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس کا دھیان ہمہ وقت ایک چیز کی طرف لگا رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ موت کی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہے، موت کا فرشتہ اس کی تاک میں ہے، مہینوں اور سالوں کی بات تو بہت دور کی ہے لمحات کی خبر نہیں، شداد اپنے عشرت کدہ میں قدم بھی نہ رکھ سکا اور موت کے فرشتہ نے اس کو آدبوچا، آدمی سالہا سال کا انتظام کرتا ہے اور اس کو پل کی خبر نہیں، بڑی سے بڑی طاقت اور شان وشوکت والے، حکومت وثروت والے عیش وعشرت کے دلدادہ آج تو وہ خاک ہیں "کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"۔

موت کا استحضار انسان کے اندر آخرت کی فکر پیدا کرنے کے لئے ہے، یہ لذتوں اور بے فکریوں کو توڑنے والی ایک حقیقت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

"اکثروا ذکر ھا ھاذم اللذات یعنی الموت" لذتوں کو ختم کردینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو۔

موت ایک یقینی اور محسوس چیز ہے، اس کے بعد تین مرحلہ ہیں جن سے ہر انسان کو گذرنا ہے اور یہ ہر ایمان والے کا عقیدہ ہے، سب سے پہلا مرحلہ برزخ کا ہے اور سب سے پہلی منزل قبر ہے، انسان کے عقیدہ وعمل کے مطابق یہیں سے جزاء وسزا کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے بعض صحابہ سے منقول ہے قبر کے پاس سے گذرتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہوجاتی، دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ آخرت کی گھاٹیوں میں سے یہ پہلی گھاٹی ہے اس میں اگر نجات مل گئی تو آگے منزلیں آسان ہیں۔

برزخی زندگی کے بعد سب سے خطرناک مرحلہ قیامت کا ہے، جس کو قرآن مجید میں یوم الدین یعنی بدلہ کا دن کہا گیا ہے، قیامت جب آنے والی ہوگی تو ساری دنیا فنا کردی جائے گی، آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، سورج، چاند بے نور ہوجائیں گے، ہر چیز فنا کردی جائے گی اور پھر حشر کے میدان میں سارے انسان جمع ہوں گے اور ان سے ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا، جو کچھ بھی اچھے یا برے اعمال انسان دنیا میں کرکے گیا وہ سب سامنے آجائیں گے، اس کا ایک ایک عضو گواہی دے گا، مجرمین کی کھالیں تک ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گی وہ کہیں گے تو کیسی گواہی دیتی ہے وہ کہے گی جس اللہ نے ہر چیز کو قوت گویائی دی اسی نے مجھے بھی بولنے کی طاقت بخشی۔

حساب وکتاب کا یہ مرحلہ بہت سخت ہے جو اس میں الجھادیا گیا وہ ہلاک ہوا اس کے بعد تیسرا مرحلہ پل صراط پر سے گزرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتما مقضیا" ہر ایک کو اس پر سے گذرنا ہے یہ آپ کے رب کا طے شدہ فیصلہ ہے، آگے ارشاد ہوتا ہے "ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا" کہ ہم تقویٰ والوں کو نجات دیں گے اور انصاف سے بچنے والوں کو منہ کے بل اسی میں ڈال دیں گے، حدیث شریف میں اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ "احد من السیف وادق من الشعر" وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اپنے اپنے عمل کے مطابق لوگ اس پر سے گذریں گے کوئی اس طرح پار ہوجائے گا جیسے بجلی کوندی ہو کوئی تیز رفتار سواری کی طرح گذر جائے گا کسی کی رفتار معمولی ہوگی کوئی گھسٹ گھسٹ کے پار ہوگا اور ایک بڑی تعداد ان نافرمانوں کی ہوگی جو کٹ کٹ کر جہنم میں گر جائے گے۔

جنت بھی برحق ودوزخ بھی برحق، اہل ایمان کا عقیدہ ہے کہ دونوں باقی رہنے والی چیزیں ہیں، ایمان والے ہمیشہ جنت میں رہیں گے، اور اگر جہنم میں جائیں

بقیہ صفحہ ۱۳ پر

سیرت

مالابار کا نظام المساجد

طریقۂ درس کی تاریخی عظمت

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

حضرت مالک بن دینارؒ مالابار تشریف لائے اور اس دیار میں انہوں نے بارہ مساجد تاریخ میں پہلی بار قائم کیں، یہی مساجد بعد میں اشاعت اسلام اور تعلیمات اسلام کا مرکز بن گئیں، آج مالابار کی ہزاروں مساجد میں قرآن وحدیث کا درس جاری ہے، یہ نظام درس صدیوں برس قدیم ہے اور نہایت کامیاب ہے، یہ طلبہ اور اساتذہ جو مساجد کے اندر رہتے ہیں اور درس نظامیہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ایک قابل رشک اسلامی زندگی گذارتے ہیں وہ زندگی جس کا ذکر حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ "شاب نشأ في عبادة الله" ایسا نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں پرورش پائی ہو ایسے نوجوان پر روز قیامت اللہ کے عرش کا سایہ ہوگا، مبارک ہیں وہ والدین جو بالکل بچپن میں اپنے لخت جگر کو مسجد بھیج دیتے ہیں حتی کہ وہ مسجد کے اندر نشو ونما پا کر اللہ کی عبادت میں جوان ہوتے ہیں، یہ علماء عوام میں اسلام کے پیامبر بنتے ہیں، لطف یہ ہے کہ بالکل چھوٹے چھوٹے بچے عمامہ باندھ لیتے ہیں، ان مساجد کے طلبہ اور علماء عمامہ پابندی سے باندھتے ہیں اور سفید دودھ جیسا لباس پہنتے ہیں، فرشتے معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے عرض کیا کہ کیرالا کی قدیم مساجد میں مینارے نہیں ہوتے، فرمایا کہ یہ اقرب الی السنہ ہے، فرمایا کہ دیکھئے ہمارے وطن تکیہ کی مسجد میں بھی مینارہ نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ میں مینار نہیں ہے اور مساجد کعبہ سے تعلق رکھتی ہیں، ایرانیوں اور ترکوں نے میناروں کا رواج ڈالا، مالابار کی مساجد کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر مسجد دومنزلہ ہوتی ہے، نیچے نماز ہوتی ہے اور اوپر طلبہ اور علماء رہتے ہیں اور تعلیم ہوتی ہے اور یہ تعلیم طویل ہے، دس برس طالب علم مسجد میں رہتا ہے، نحو وصرف، معانی وبیان، منطق وفلسفہ، حدیث وتفسیر اور فقہ شافعی کی اعلیٰ کتابیں پڑھتا ہے، گرامر میں خوب مضبوط ہوتا ہے، الفیہ حفظ کر لیتا ہے، لکھنے بولنے کی مشق نہیں کرائی جاتی پھر بھی طلبہ عربی بول لیتے ہیں، مگر ان مساجد میں علوم اسلامیہ کی تکمیل نہیں کرائی جاتی، بلکہ تکمیل کے لئے یہ طلبہ مساجد سے نکل کر ندوہ، دیوبند اور باقیات الصالحات ویلور جاتے ہیں، ۸۰ فیصدی طلبہ باقیات جاتے ہیں، وہ ویلور میں ہے قریب ہے ایک رات کا سفر ہے، تہذیب وثقافت کا فرق بھی کم ہے مگر لطف یہ ہے کہ باقیات الصالحات میں ہر طالب علم کو اردو پڑھائی جاتی ہے، اس بنا پر وہ طلبہ جو ملیباری ہیں اور وہ باقیات الصالحات سے فارغ ہوتے ہیں وہ حتمی طور پر اردوداں ہوتے ہیں ان کو کم از کم دو برس اردو زبان پڑھائی جاتی ہے، یہ مولوی عالم یا فاضل کا کورس پاس کرتے ہیں، ویلور میں باقیات الصالحات کو جنوب کا دیوبند تصور کیا جاتا ہے، ایسے علماء کو زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے جو ندوہ، دیوبند باقیات الصالحات کے فارغ ہوں۔

مالابار میں مساجد بہت زیادہ ہیں اور ہر بڑی مسجد میں درس سسٹم جاری ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان طلبہ اور اساتذہ پر خرچ کرنے کے لئے مال کہاں سے آتا ہے اور کون ان پر پیسے خرچ کرتا ہے؟ یہ بڑا معنی خیز اور دلچسپ سوال ہے یہاں اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ مسجد کے آس پاس اس قریہ میں رہتے ہیں جہاں مسجد واقع ہے وہ لوگ اپنے ناریل کے باغات میں سے دس بیس درخت حسب توفیق مسجد کو وقف کر دیتے ہیں، واضح ہو کہ ناریل کا درخت سال میں ۸ فصلیں دیتا ہے ہر چالیس روز پر فصل کاٹی جاتی ہے، یہ مسجد کے وقف ناریل مسجد کے اندر لائے جاتے ہیں اور وہیں سے فروخت ہو جاتے ہیں اور یہ رقم مسجد کو مل جاتی ہے، اسی رقم سے مدرس کی تنخواہ اور طلبہ کا خرچ نکلتا ہے، ناریل کے درخت میں ایک ہی وقت میں پھل اور پھول سال بھر آتے رہتے ہیں، یہ سدابہار درخت ہے ابن بطوطہ نے ناریل کے پھل کو آدمی کے چہرہ سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ اس میں دو آنکھیں اور ایک منہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے انسان کی دو آنکھیں اور ایک منہ ہے، کچھ طلبہ گھروں میں کھاتے ہیں، مدرس کو بھی کھانا فراہم کیا جاتا ہے، البتہ میں نے ایک بڑے مدرسہ میں دیکھا ہے کہ خود مسجد میں مطبخ تھا اور طلبہ کا کھانا مسجد میں تیار ہوتا تھا، ۱۰ طالب علم سے ۵۰ طالب علم ایک مسجد میں بالائی منزل میں رہتے ہیں، عالم یا مدرس ایک یا دو ہوتے ہیں ناشتہ کے بعد سے ظہر تک پھر ذرا آرام کر کے عصر تک پھر مغرب بعد بھی درس ہوتا ہے، یہ عالم عوام الناس میں ایک معتبر ہستی تصور کیا جاتا ہے۔

مساجد کے ان مدارس میں عربی زبان میں نظموں کے گانے کا رواج ہے، یہ دعائیں بعد نماز مغرب گروپ کی شکل میں پڑھی جاتی ہیں، عربی زبان میں، اور طلبہ ان کو یاد کرتے ہیں، یہ نظموں اور دعاؤں کا مجموعہ ہے، امام بصری کا نعت اور کعب بن زہیر کا قصیدہ بردہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے طلبہ یہ نظمیں اس دلکش نغمے گاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔

ایسا نظام درس یہاں کیرالا میں پایا جاتا ہے اور مساجد سے علماء تیار ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ حضرت مالک بن دینار کے دور سے چلا آرہا ہے، اس نظام کے اثرات مسلمانوں کے معاشرتی اور دینی احوال پر پوری طرح مرتب ہوتے ہیں، ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ تم یہاں سے فارغ ہو کر کیا کروگے؟ اس نے کہا میں مدرس بن جاؤں گا اور درس دوں گا، یعنی طلبہ کا ذہن صاف ہوتا ہے، مگر یاد رہے کہ یہ طلبہ جو مسجد میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں وہ حکومت کے اسکول سے پانچواں یا ساتواں پاس کر کے جاتے ہیں، بالکل جاہل طالب علم کو مسجد میں داخل نہیں کیا جاتا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو طلبہ درس میں داخلہ لیتے ہیں وہ اس آبادی کے نہیں ہوتے جہاں مسجد واقع ہے، مقامی طلبہ کو مسجد میں داخلہ نہیں ملتا ان کو کسی دوسری جگہ جانا پڑتا ہے تاکہ والدین مدرس پر اور مجلس انتظامیہ پر اثر نہ ڈالیں۔

قال اللہ وقال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضا میں رہ کر اللہ کی عبادت میں اور اس کے دین کی تعلیم میں نشو ونما پا کر وہ نوجوان عالم بن کر مسجد سے نکلتا ہے، اور اس طرز کے مدرسوں کی مثال پورے ہندوستان میں کہیں موجود نہیں ہے، ان طلبہ کی تربیت اور ٹریننگ کا ایک بڑا دلچسپ طریقہ ہے، ہر جمعہ کو مختلف مساجد میں ان طلبہ میں سے ایک طالب علم ایک مسجد میں آجاتا ہے اور بعد نماز جمعہ تقریر شروع کر دیتا ہے،

پروفیسر ای، کے، احمد کٹی صاحب نے اپنے انگریزی مقالہ میں اس سسٹم کے بارے میں معلومات پیش کی ہے۔

Othupallys اوتوپلی وہ بنیادی مدرسے ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے قبل طالب علم کو اس میں داخلہ کے لئے تیار کرتے تھے، درس دراصل اعلیٰ اسلامی تعلیم کے ادارے ہیں، یہ اعدادی مدرسے مسجد سے قریب ہوتے تھے، اور ان میں ساری تعلیم زبانی ہوتی تھی، تختی پر سیاہی سے لکھنے کے علاوہ کاغذ اور سلیٹ وغیرہ کا استعمال نہ تھا، جو طلبہ صرف نماز، قرآن (ناظرہ) اور سورتیں یاد کرنے کے لئے آتے تھے وہ اپنا کورس مکمل کر کے گھر چلے جاتے تھے جو طلبہ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے خواہش مند تھے وہ مسجد میں داخل ہو جاتے تھے، قلم، پنسل اور بلیک بورڈ کا کوئی انتظام ان زبانی تعلیم کے مدرسوں نہ ہوتا۔

استاد کے گرد طلبہ جمع ہو جاتے اور تعلیم شروع ہو جاتی۔

یہ قدیم طریقہ تھا اب ساتویں تک حکومت کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس میں مسجد میں داخلہ ملتا ہے تاکہ طالب علم ایک معیار تک پہونچ جائے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہند میں پانچ تک پڑھ کر عربی مدرسہ میں طالب علم کو داخل کیا جاتا ہے، یا ضرورت کے مطابق اعدادیہ کلاس کا نظم کیا جاتا ہے۔

درس سسٹم کیرالا کی خصوصیت ہے اسی بنا پر مساجد کیرالا میں دومنزلہ ہوتی ہیں (اور اب تو کئی کئی منزلیں بننے لگی ہیں) سب سے عظیم مسجد وہ ہے جو پنانی میں واقع ہے یہ عظیم جامع مسجد ۸۰۰ برس قبل تعمیر ہوئی، جس کو فخر الدین بن عبدالقادر الخراسانی نے تعمیر کیا تھا، یہ بزرگ مشہور صوفی شیخ عبدالقادر بن علی پندرھویں صدی عیسوی میں پنانی آئے تو یہ شہر اسلامی تعلیم کا ایک بڑا مرکز قرار پایا اور اس کی عظمت وتقدس کا یہ عالم ہو گیا کہ وہ ابتک چھوٹا مکہ کہلاتا ہے، اس مسجد کے درس سے بڑے بڑے علماء متعلق رہے تحفۃ المجاہدین کے مصنف شیخ زین الدین مخدوم بھی اسی جامع مسجد سے متعلق رہے۔

نظام درس میں بنچ، کرسی، میز، بلیک بورڈ اور چاک وغیرہ کا استعمال نہ ہوتا تھا اور اب بھی نہیں ہوتا، درس کا طریقہ یہ ہے کہ استاذ کے گرد طلبہ بیٹھ جاتے ہیں استاد عربی عبارت پڑھتا ہے اور اس کا ترجمہ ملیالم زبان میں کرتا ہے، یہ ترجمہ لفظی ہوتا ہے استاد حکم دیتا ہے طلبہ کو کہ وہ ترجمہ کو دہرائیں، طلبہ اس طرح سبق کو یاد کر لیتے ہیں، شروع میں درس کا نظام بہت جامع تھا اس میں جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ شامل تھے علم حساب، علم طب، علم تصوف، یا عربی علوم وفنون، فقہ، علم النجم، جیومیٹری، اور فلسفہ ومنطق شامل تھا مگر رفتہ رفتہ نصاب کم ہوتا رہا تو حدیث، فقہ، تفسیر گرامر پر زور دیا جاتا ہے، تفسیر جلالین، فقہ میں زین الدین مخدوم کی فتح المعین اور حدیث میں مشکوۃ پڑھائی جاتی ہے، بعض رسائل فقہ اور تصوف کے بھی پڑھائے جاتے ہیں، عربی زبان پر بالکل زور نہیں دیا جاتا، مذہبی علوم پڑھائے جاتے ہیں، حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کے ساتھ ادب بھی پڑھایا جائے، عربی کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھایا جائے۔

نظام درس کے نقائص کے باوجود یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ اس نظام نے عربی واسلامیات کی تعلیم کی شمع صدیوں سے روشن کر رکھی ہے کتنے دلوں کو اور کتنے اذہان کو اس نے روشن کر دیا ہے، اس نے اس علاقہ میں بڑے بڑے عباقرہ اور علماء اسلام کو جنم دیا ہے، بڑے بڑے مصلحین انہیں مدارس سے اٹھے ہیں جن کی شمع مساجد مالابار میں روشن ہے۔(۱)

کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

❁❁❁

بقیہ: عقیدۂ آخرت.............

گے تو اپنے اعمال کی سزا پانے کے بعد جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، اور کفار ومشرکین ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

آخرت کی زندگی میں صرف اعمال کام آئیں گے، نہ وہاں مال ودولت کام آئے گی، نہ گھر والے کام آئیں گے، دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے جو جیسا عمل یہاں کرے گا وہاں اس کے مطابق اس کو پھل ملے گا، ارشاد ربانی ہے:

فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره، ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره "جو ذرہ برابر بھی بھلائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور جو ذرا برابر بھی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ ❁❁❁

---

(۱) احمد کٹی ان ساؤتھ انڈیا مقالہ عربی تعلیم کیرالا میں از: پروفیسر احمد کٹی مطبوعہ کالی کٹ یونیورسٹی (جنوری ۲۰۰۳ء ص ۵۳ تا ۵۶)

نقوش سیرت صلی اللہ علیہ وسلم
از
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ملنے کا پتہ:-
MAKTABA Al-HASANI
Maulana Abul Hasan Ali NadwiMemorial Centre,First Floor, A.N.S. Plaza,Beside Mallepally Mosque.
HYDERABAD-500001 (A.P.)

شخصیت

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشیؒ
ملت کی ایک دردمند اور رہبر شخصیت

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی

الحمد للّٰہ رب العالمین ، و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد ، و علی آلہ و صحبہ أجمعین ، أما بعد :

جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے اگست کی ۲۶ تاریخ کو اس جہان فانی سے جہان باقی کو رحلت کی، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون ، ڈاکٹر صاحب نے سن شعور کو پہونچنے کے وقت سے ہی ملت کے صلاح وفلاح کی فکر کو اپنی فکر بنایا، اور اپنے محدود حلقہ ہی میں اصلاح ودعوت کے کام میں دلچسپی ظاہر کی، پھر یہ سلسلہ برابر قائم رکھا، اور ملت اسلامیہ کی تعمیری واصلاحی تحریکوں میں اپنی صلاحیتوں اور ضرورت عمل کے مطابق نہ صرف یہ کہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ساری زندگی پوری فکرمندی کے ساتھ اس میں لگے رہے، بلکہ ملت کے متعدد سماجی وتعلیمی پہلوؤں میں قائدانہ کردار انجام دیا، وہ ایک بصیرت رکھنے والے رہبر اور ملت کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہر وقت مستعد اور کارفرما رہنے والے فرد تھے، طالبعلمی کے زمانہ میں اپنے وطن پرتاپ گڑھ میں نوجوانوں اور طلباء میں دینی فضا بنانے کے لئے کوشاں رہے، اور تعلیم سے فارغ ہوکر ملکی حالات کے نشیب وفراز میں ملت اسلامیہ کے دینی وملی مقام بلند کے تحفظ کے کاموں میں پوری توجہ سے شرکت کرتے رہے تھے، اس سلسلہ میں ان کا ربط وتعلق دیگر قائدین ملت سے قائم ہوا، ان میں نمایاں اور خاص طور پر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہما، اور عصری شخصیتوں میں ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور اسی سطح کی دیگر مشہور شخصیتیں تھیں، علماء کے طبقہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا شروع ہی سے قریبی ربط تھا، حضرت مولانا سے اس ربط ہی کا اثر تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ملی اور دینی جدوجہد میں جو میدان اختیار کئے ان سب میں ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے اچھے معاون بنے، حضرت مولاناؒ کو بھی ان سے قریبی انس اور ربط تھا، اور مولانا کو ان پر بڑا اعتماد رہتا تھا، مولاناؒ کے اختیار کردہ ملی ودینی کاموں کے خاص میدان عمل میں ندوۃ العلماء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اصلاح معاشرہ اور پیام انسانیت کے ادارے رہے، ان سب میں ڈاکٹر صاحب پورے تعلق خاطر اور ان کاموں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے حضرت مولاناؒ کے ساتھ شریک رہے، دعوت وتبلیغ کی تحریک سے بھی ڈاکٹر صاحب کو دلچسپی رہی، اور اس میں شرکت کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی عملی زندگی ان کے سماجی ودینی کاموں کے آغاز کے وقت سے وفات کے وقت تک تقریباً پچپن سال پر محیط رہی، ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی، دینی اور سماجی میدانوں میں ایسی تحریکوں اور کوششوں کا عمل دخل رہا جن کا تعلق ملت اسلامیہ ہندیہ کی اسلامی خصوصیات کو چیلنج کا سامنا کرنے سے رہا تھا، اس میں تعلیمی میدان میں اکثریتی طبقہ کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کا اسلامی مزاج ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں، اور ان کا مقابلہ مسلمانوں کے اہل غیرت لوگوں نے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے کیا، ان میں پیش پیش قاضی محمد عدیل عباسی اور حضرت مولانا اور ان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی رہے، جس میں دیگر اہم شخصیتوں کی وفات کے بعد تنہا ڈاکٹر صاحب اس کے اہم ذمہ دار ہوئے، جس کو انہوں نے انتقال کے وقت تک نبھایا، کونسل کے وہ جنرل سکریٹری رہے، اسی طرح سماجی وثقافتی میدان میں مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی تحفظ کو ختم کرنے کی کوششیں فسادات کے ذریعہ کی گئیں، اس کے مقابلہ کے لئے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، جس نے اس معاملہ میں اہم کردار انجام دیا، ڈاکٹر صاحب اس کے نمایاں رہبروں میں خاص طور پر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ نمایاں طریقہ سے شریک رہے، اور اس میں مختلف موقعوں پر انہوں نے مولانا علی میاں صاحب کی نمائندگی بھی کی، اسی طرح اس ملک میں اسلامی شریعت کے تحفظ کو سخت خطرہ لاحق ہوا جس کے مقابلہ کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، جس کے مشوروں اور کارگزاریوں میں ڈاکٹر صاحب نے پورا حصہ لیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کا ربط وتعلق چونکہ ابتداہی سے ہوگیا تھا اس لئے وہ بتدریج ان کے لئے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہوگئے تھے، اسی طرح حضرت مولاناؒ کے دیگر معاونین اور اعزہ کے ساتھ بھی ان کا بہت برادرانہ تعلق قائم ہوگیا تھا، حضرت مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی کے برادر اکبر اور شہر کے ممتاز معالج ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحبؒ سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا، اور بتدریج بڑھتا گیا، ان سے ان کا یہ تعلق بحیثیت معالج اور بحیثیت تیماردار اور ان کی شخصیت کے قدرداں کی حیثیت سے رہا۔ اور ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر صاحب ہی نے ان کے مطب کو بحیثیت معالج کے سنبھالا، اس طرح ڈاکٹر صاحب کے تعلقات ان کے پورے حلقہ کے لوگوں سے بہت قریبی ہوگئے، اس قرب کی وجہ سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے برادر اکبر رحمۃ اللہ علیہما کے چھوٹوں سے جن میں خاص طور پر یہ راقم الحروف اور ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے صاحبزادے مولانا سید محمد الحسنی تھے، ڈاکٹر صاحب کا برادرانہ اور دوستانہ تعلق قائم ہوا، اس میں خاص طور پر ملی معاملات میں ہم مذاقی اور وحدت فکر کا عمل رہا، اسی لئے سید محمد الحسنیؒ کا جب انتقال ہوا، جو ایک طرح سے کم عمری میں ہوا تھا، کیونکہ ان کی عمر اس وقت صرف ۴۴ سال کی تھی، جس کی بنا پر سب کو ان کے جیسے باصلاحیت نوجوان کے انتقال پر بہت رنج ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس خاص طور سے اپنے ایک دوست اور بھائی کے رخصت ہوجانے کا ہوا، اور انہوں نے اسی طرح کا اظہار اپنے ایک مؤثر مضمون میں ندائے ملت میں کیا۔

لکھنؤ میں ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی اور ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کا امت کے سماجی اور ثقافتی مسائل میں ایک مضبوط ارتباط قائم ہوگیا تھا، اس کے تحت فکری اور اطلاعاتی مقاصد کے لئے پہلے ایک روزنامہ ''قائد'' نکالا گیا، پھر ہفت روزہ ''ندائے ملت'' کا اجرا ہوا، ندائے ملت سے ڈاکٹر صاحب کا بتدریج ایسا گہرا تعلق قائم ہوا کہ انہوں نے اس کو بالکل اپنا ایک بہت عزیز ترجمان بنالیا، جس کو وہ اپنی زندگی کے آخر تک نبھاتے رہے۔

تعلیمی میدان میں دینی تعلیمی کونسل کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے عصری تعلیم سے بچوں کو آراستہ کرنے کے لئے ایک انگریزی میڈیم اسکول نور الاسلام اسکول کے نام سے قائم کیا، اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کی ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک معیاری اقامتی ادارہ جامعہ نور الاسلام کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے لڑکیوں کی دینی تعلیم کے رجحان کو تقویت ملی اور فروغ حاصل ہوا۔ یہ ادارہ وقیع انداز میں کام کررہا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کو بڑی معاونت ان کی اہلیہ صاحبہ اور بڑی صاحبزادی سے حاصل رہی جو کہ جاری ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ نے جب یورپ کا پہلا سفر کیا جس میں ان کو جنیوا کے اسلامک سینٹر کے ٹرسٹی بورڈ میں بحیثیت رکن کے شریک ہونا تھا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا رفیق سفر بنایا، اور قابل معاونت موقعوں پر ان کی معاونت سے فائدہ اٹھایا، اس سفر میں حضرت مولاناؒ نے اسپین کا بھی سفر کیا، اور اس سفر سے ایک مسلمان اور ایک مؤرخ کی حیثیت سے فائدہ اٹھایا، اور ایک داعی کی حیثیت سے وہاں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جس کا تذکرہ اور جس کی یاد عرصہ تک اسپین کے حالات سے سابقہ پڑنے والے لوگوں کے یہاں محسوس کی جاتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب نے ملت اسلامیہ کے فروغ اور اس کے اعلیٰ مقام کے تحفظ کے سلسلہ میں بڑے مخلصانہ جذبہ اور نہایت فکرمندی کے ساتھ کام کیا، بلکہ اپنی زندگی کو اس کے لئے وقف کردیا تھا، ان کو بحیثیت معالج کے بڑی شہرت حاصل تھی، اور علاج ومعالجہ ان کا معاشی ذریعہ تھا، لیکن ملت کی ضرورت کے لئے وہ بے تکلف وقت نکالتے اور سفر کرتے، اور اپنی طبی مشغولیت کو جو ان کی معاشی مشغولیت تھی اس کے لئے قربان کرتے رہتے تھے، وہ ملت کی ضرورتوں پر جہاں تقاضہ ہوتا تھا بڑی فیاضی کے ساتھ خرچ بھی کرتے تھے، ممتاز دینی مقام رکھنے والوں سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے، اور خود بھی ان کے دیندارانہ طریقۂ حیات کو اختیار کرنے کا اہتمام کرتے تھے، ان کا ظاہری حال علماء کی طرح تھا، اور باطنی طور پر عبادت اور صلاح وتقویٰ کے وہ بڑے پابند تھے، تہجد گذار اور خیر وخیرات کا بھی اہتمام تھا، وہ اپنی اجتماعی اور دینی کوششوں میں اخلاص اور رضائے الٰہی کی طلب پر عامل تھے، ملت کی جن ضرورتوں کو اساسی سمجھتے تھے اپنے آپ کو ان میں کھپانے کا رویہ اختیار کرتے تھے، اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں انہوں نے دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کو تو بالکل اوڑھ لیا تھا، اور اپنے کو اس میں پوری طرح مشغول کردیا تھا۔

بہت سے واقعات ایسے پختہ مقدرات ہوتے ہیں جن میں کسی بھی انسان کو خواہ کتنا ہی ولی اور بزرگ ہو اختیار نہیں ہوتا ہے، اسی میں عمر کا معاملہ بھی ہے، اس لئے اس سانحہ میں بھی صبر اور رضا بالقضاء ہی اختیار کرنا ہے، اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی کوششوں اور ان کے اعمال صالحہ کا اضعافاً مضاعفہ اجر عطاء فرمائے، اور جو لغزشیں ہوں ان کو معاف فرمائے۔

انہوں نے اپنے بیشتر صاحبزادوں کو دینی تعلیم دلائی، اور بنیادی ضروری علوم سے بھی آراستہ کیا، وہ سب سعادت مند اور صالح زندگی والے بنے، ان میں خاص طور پر ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد شعیب قریشی انہی کے طریقۂ کار اور ان کے اختیار کردہ راستہ پر ہیں۔ دیگر صاحبزادوں میں مولوی محمد صہیب قریشی، مولوی محمد جنید قریشی اور مولوی محمد عبید قریشی، اور تینوں ندوی بھی ہیں، ڈاکٹر صاحب کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ سب ان کے اچھے جانشین ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے سب پسماندگان کو برکتوں اور نعمتوں سے نوازے، اور ان کو اپنے والد رحمہ اللہ کی توقعات کے مطابق بنائے، آمین۔

❁❁❁

متاعِ فقیر

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اِسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اِسے

(اقبالؔ)

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک دور افتادہ صدا

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے مجاہدین آزادی کی صفوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، مگر ابوالکلام محض کسی سیاسی لیڈر کا نام نہیں ہے، وہ ایک روشن ستارہ تھا جو آسمان ہند پر اس لیے طلوع ہوا تھا کہ صبح آزادی کی آمد کا اعلان کرے اور بشارت دے کہ اب زندگی ایک نئی کروٹ لینے والی ہے، اب جو دن طلوع ہوگا وہ مظلوموں کی بالادستی اور چیرہ دستوں کی شکست و پستی کا دن ہوگا، وہ ایک شعلۂ جوالہ تھا جس نے ظلمتوں کے دامن کو تار تار کر دیا تھا، اس کے قلم نے نصف صدی تک ایسی آگ برسائی کہ سامراجیوں کی توپ و تفنگ کو تودۂ خاکستر میں بدل کر رکھ دیا، اس کی زبان نے اپنی خطابت سے وہ سیلِ بے اماں پیدا کیا کہ ظالم سامراج کے سفینے کو دامانِ ساحل تک پہنچنا دوبھر ہو گیا۔

مولانا آزاد انیسویں صدی کے نصف آخر کی پیداوار تھے اور بیسویں صدی کے نصف اول پر چھا رہے، اس طرح انہوں نے دو صدیوں کے قدیم و جدید گہواروں میں پرورش پائی، قدیم نے ان کو سنوارا تھا تو جدید نے نکھارا تھا، ان کے ذہن میں حدت ہی نہیں جدت بھی تھی، خیالات تر و تازہ اور شاداب تھے، افکار میں مذہب، فلسفہ، اور سماجی علوم کا ایک سنگم بن گیا تھا، جس میں مشرق و مغرب کے دھارے یوں پیوست ہو گئے تھے کہ قدامت کی آب اور جدت کی تاب دونوں ہی اپنی پھبن دکھاتے تھے، وہ خود کہتے ہیں "جو کچھ قدیم ہے وہ ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالیں، میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں، خاندانی تعلیم اور سوسائٹی نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا میں نے اول روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں روک نہ ہو سکیں، تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا۔"

انہوں نے رائج الوقت معیار کے مطابق عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی، اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینیات کا ناقدانہ مطالعہ کیا اور علوم قرآنیہ میں گہری بصیرت پیدا کی، اس کے ساتھ ہی وہ انگریزی ادبیات سے، اور عمر کے آخر دور میں کسی قدر فرانسیسی ادب سے بھی واقفیت حاصل کرتے رہے، مبدأ فیاض سے اجتہادی فکر کا ملکہ ودیعت ہوا تھا، اوائل عمر ہی سے اپنے ماحول کے سکوت و جمود کو توڑنے کے لیے وہ ایک انقلابی صدا، ایک باغی کی للکار بن گئے، یہی جذبہ انہیں میدان سیاست میں کھینچ لایا اور انہوں نے تقریباً نصف صدی تک اپنے قلم سے اور شعلہ بار خطابت سے ایسا جادو جگایا کہ غلامی کی زنجیروں میں ہانپتے ہوئے ہندوستانیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان میں ایسی غیرت اور اتنا حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ ان سلاسل کو ریزہ ریزہ کر دیں اور آزادی کے میدان میں قدم بڑھاتے ہوئے ترقی کی منزلوں میں اقوام عالم کے ہمدوش ہو جائیں۔

سیاست میں مولانا آزاد کا نظریہ خالص وطن پرستی اور متحدہ قومیت کا نظریہ تھا، انہوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مذہب کے دائرے سے نکل کر وہ اپنی شناخت کرانے پر کبھی رضامند نہ ہوتے، مگر انہوں نے مذہب کو کبھی اپنے سیاسی نظریات پر غالب نہ آنے دیا اور بڑے قومی مفاد کو مذہبی تنگ نظری کی قربان گاہ پر کبھی نہیں چڑھایا، اور مولانا آزاد کا میدان سیاست میں کود پڑنا کسی ذاتی مفاد یا نام و نمود کی خواہش کا تقاضا نہیں تھا، غالب نے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ میں کچھ اپنی خوشی سے شعر نہیں کہتا بلکہ خود شعر نے یہ خواہش کی تھی کہ وہ میرا فن بن جائے۔

مانبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آن کہ گردد فن ما

اسی طرح سیاست نے مولانا آزاد کو اپنی طرف کھینچ لیا، اگر وہ غلامی کا دور نہ ہوتا، اہل وطن ذلت اور استحصال کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے، تو مولانا آزاد کبھی سیاست کا رخ نہ کرتے اور اپنے فکر و فلسفے کے عالم دیگر میں ہی مگن رہتے، مگر آزادی وطن کے لیے انہوں نے اتنی بڑی قربانی دی کہ اپنے اعلیٰ پائے کے علمی کارنامے بھی نامکمل چھوڑ دیے، یہ علمی دنیا کا ایسا نقصان اور ایسی حرماں نصیبی ہے جس کی کبھی کچھ تلافی نہیں ہو سکتی، میدان سیاست میں جس نظریاتی پلیٹ فارم پر انہوں نے پہلے دن اپنے قدم جمائے تھے اس میں کوئی لرزش یا لغزش نہ آنے دی، نہ اغیار کی بے اعتنائی سے افسردہ ہوئے نہ اپنوں کی بیوفائی سے آزردہ، مگر ایک موقع پر دل کا کانٹا نکل گیا تو کیسی حسرت سے کہتے ہیں:

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں، افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے، تم نمائش کے پجاری ہو، شور و ہنگامے کے بندے اور وقتی جذبات و انجذاب و ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔"

دوسرے ایک موقع پر انہوں نے شکوہ کیا ہے کہ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کے منبر سے ان کی وہ آخری صدا گونجی تھی جس میں ابوالکلام کا پورا جلال اور جمال جھلک رہا تھا، اس کے بعد تو وہ میر کے لفظوں میں "منقار زیر پر" ہی رہے اور رسمی تقریروں سے زیادہ ان کی زبان سے کچھ نہ نکلا، انہوں نے کیسے دل کو چھونے والے لفظوں میں کہا تھا "سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں، ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی بے وطنی کی زندگی گزاری ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چنا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے، سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو، یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے..... ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا: "جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی، ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں..... آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے، یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

مولانا آزاد نے سیاست کے لیے صحافت کی راہ اختیار کی، الہلال اور البلاغ اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں بقائے دوام کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، الہلال گھپ اندھیرے میں روشنی کی تیز کرن بن کر پھوٹا تھا جس نے خواص کے دل و دماغ کو جھنجھوڑا اور عوام کے لہو کو گرمایا تھا، آزادی ہند کی تاریخ میں الہلال کی خدمات کو فراموش کر دیا جائے تو اس سے بڑی احسان فراموشی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مولانا ایک دانشور تھے، عصری مسائل پر ان کی نظر گہری تھی، اپنی خطابت میں وہ نہایت جذباتی اور انقلابی تھے مگر ان کے سیاسی نظریات جذبات کی پیداوار نہیں تھے، وہ ٹھنڈے منطقی دماغ سے مسائل کا تجزیہ کرتے تھے اور وقتی جوش میں بہہ نہیں جاتے تھے، ان کا ذوق جمالیات بھی رچا ہوا اور منفرد تھا، وہ مذہبی عالم ہونے کے باوجود، موسیقی و مصوری کے رموز و لطائف سے بھی آگاہ تھے اس کا اندازہ غبار خاطر کے مطالعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے، فارسی، عربی اور اردو شعر و ادب کا بڑا ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے اور اپنی تحریروں میں اشعار نگینوں کی طرح جڑ دیتے تھے، ان کا اسلوب نثر بھی یگانہ و یکتا تھا، جس میں ہندوستانی بولی کی صلابت اور کھرا پن، فارسی کی جاذبیت اور شیرینی، عربی خطابت کا جلال و جبروت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کی نظر حکیمانہ، دماغ فلسفیانہ، احساس شاعرانہ اور مزاج قلندرانہ تھا، وہ لکھتے یا بولتے تھے تو "ماورائے سخن" بھی ان کے جذبات کوندے کی طرح لپکتے تھے، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سیل افکار میں الفاظ خس و خاشاک کی طرح بہہ رہے ہیں، ہندوستان کی سیاسی تاریخ نے ان سے بڑا خطیب اور مقرر پیدا نہیں کیا، جس کی آواز دل کے بعید ترین گوشوں سے ٹکراتی ہو، مگر مولانا آزاد کے علم و فضل اور فکر و فلسفے نے ان کی شخصیت کے گرد متانت اور وقار کا ایک ایسا حصار بھی کھینچ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کبھی "عوامی لیڈر" نہیں بن سکے، یعنی عوام سے ان کا رابطہ اتنا براہ راست نہیں تھا جتنا مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تھا، تحریک آزادی میں، اور حصول آزادی کے بعد بھی، مولانا آزاد کی حیثیت دماغ کی سی تھی، گاندھی جی اس تحریک کا ضمیر اور پنڈت نہرو اس کا قلب تھے۔

مذہب میں اجتہادی راہ نکالنا آسان نہیں بلکہ پرخطر ہے، مولانا آزاد کی مذہبی فکر بھی مجتہدانہ شان ہے، انہوں نے مذہبی مسائل و مباحث پر بھی گہری بصیرت اور فکر کے ساتھ لکھا ہے، اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک قرآن کریم کی سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، مولانا آزاد نے بھی ترجمان القرآن لکھنی شروع کی جو ناتمام رہ گئی مگر اس نقش ناتمام میں بھی ان کی منفرد شان پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے، سورۂ فاتحہ کی جیسی منفرد تفسیر مولانا آزاد نے لکھی ہے اسے تو بلاشبہ علوم قرآنیہ کے ذخیرے میں ایک قابل فخر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد یقیناً ایک عبقری (Genius) ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور اپنی وضع کے طرحدار دانشور تھے جو آخری دور میں آئے مگر بقول ابوالعلا المعری وہ کچھ لے کر آئے جو ان کے پیشرو نہ لا سکے تھے، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب منڈی میں مولانا آزاد جیسے دانشوروں کی کساد بازاری کا سکہ چل رہا تھا اور طوق زریں کو گردن خر ہی کا زیور سمجھا جاتا تھا، عربی کے مشہور شاعر ابوالطیب المتنبی کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دانشور نعمتوں میں رہ کر بھی روحانی کرب و اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور ایک جاہل انسان شقاوت میں بھی عیش کر لیتا ہے، مولانا آزاد کی تحریروں سے ان کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا دشوار نہیں، انھوں نے پوری زندگی ایک عظیم قومی مقصد کے لیے وقف کر دی، عمر عزیز کا بہترین حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیا، ایثار و قربانی کے ہر موقع پر آگے رہے اور ایسی بھرپور زندگی گزار کر بھی اس طرح چلے گئے جیسے کوئی درویش دامن جھاڑ کر اٹھ جاتا ہے، انہیں اس کا یقیناً صدمہ تھا کہ ان کی انتہائی مخلصانہ کوششوں کے باوجود ملک تقسیم ہوا اور لاکھوں انسان آوارہ و بے خانماں ہوئے، لیکن تقسیم کے بعد بھی برصغیر میں امن و آشتی کے سب سے بڑے علمبردار اور صلح و بقائے باہم کے طلبگار بھی رہے، انہوں نے آزادی کے

بعد اس ملک کی تعمیر نو میں اور مستقبل کا خاکہ بنانے میں بھی ورپردہ رہ کر بہت اہم رول ادا کیا تھا، وہ پنڈت نہرو کے سب سے زیادہ مخلص اور معتمد مشیر بنے رہے، وہ جانتے تھے کہ اس ملک کی جہاں پانچ سو سے زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں، بھانت بھانت کی رسمیں اور مختلف مذاہب ہیں، تہذیب وثقافت کی ایک طویل اور رنگ برنگی تاریخ ہے، اگر کسی شیرازے سے باندھا جاسکتا ہے تو وہ قومی اتحاد، سیکولرازم، باہمی رواداری کی ڈور ہی ہوسکتی ہے، اس کے لئے انہوں نے رہنما خطوط بھی بنائے تھے مگر فرقہ پرستی کی زہریلی ہواؤں کے جھکڑ ہر نقشے کو مٹاتے رہے، اس نے بھی آخر عمر میں مولانا کے ذہنی وروحانی کرب کو دو چند بلکہ دہ چند کردیا تھا، اگر غیروں کی حکومت ہوتی تو وہ ایک بار پھر میدان میں کود پڑتے، مگر اب جو بساط بچھی تھی اس کے بچھانے میں تو خود ان کا ہاتھ بھی شامل تھا اس لیے فریاد کرتے تو کس سے کرتے؟ وہ اپنے کنج عزلت میں سمٹتے گئے اور بقول خود "ایک دور افتادہ صدا" بن کر رہ گئے۔

مگر ہم ہوش کے کانوں سے سنیں تو اس مرد مجاہد کی وہ "دور افتادہ صدا" آج بھی فضا میں لرزش پیدا کررہی ہے، وہ شعلہ تو آج بھی رہ رہ کر ہمارے دلوں کی طرف کوندے کی طرح لپک رہا ہے مگر ہم نے اپنے دل ودماغ کی کھڑکیاں بند کرلی ہیں، وہ آواز آتی ہے اور صدائے بازگشت بن کر پلٹ جاتی ہے، اس مرد آگاہ کی زندگی میں کسی نے اسے نہ پہچانا تو اب جب کہ آدھی صدی اور تین نسلوں کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو کر حجاب بن گیا ہے اب کون پہچانے گا، جب وہ للکار رہا تھا اس وقت کسی نے کان نہ دھرے تو اب کون سنے گا؟

بقول میر

سنگ کو موم کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہوا

٭٭٭

ادب ملک وملت کی تعمیر واصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ

(عالم گیر رابطۂ ادب اسلامی کے ہندوستانی دفتر کے افتتاح کے موقع پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا اظہار)

عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے علم بردار نائب صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے آج یہاں مصطفیٰ منزل، بٹونہ پارک اوکھلا، جامعہ نگر میں واقع عالم گیر رابطۂ ادب اسلامی کے ہندوستانی دفتر کا افتتاح کیا، رابطۂ ادب اسلامی ہند کے قیام کی تاریخ اور اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ رابطہ کا مقصد بانی رابطہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نقطۂ نظر سے ادب کے ذریعہ پھیلی ہوئی بے ادبی کی روایات کا ازالہ اور ادب وسلیقہ اور شائستگی کی روایات کا فروغ ہے، اسلامی ادب چونکہ انسانی ادب کا دوسرا نام ہے، اور اسلام محض سلامتی اور وحدت الٰہ کے ساتھ ساتھ وحدت انسانیت کا مذہب ہے، جو تمام اولاد آدم کے درمیان انسانی مساوات اور اخلاقی اقدار کے پیام کی نشر واشاعت کے ذریعہ ہی ابدی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے، اس لیے اسلامی ادب کا مقصود ومطلوب انسانیت کی تعمیر، اخلاق وکردار کی ترویج، سوز حیات ابدی کی تحریک اور ابدی کامیابی کی رہنمائی ہی ہے، ادب کی اہمیت اور خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے بانیٔ رابطہ حضرت مولانا علی میاںؒ کا وہ اختتامی خطبہ یاد دلایا جو ادب اسلامی کے پہلے سیمینار منعقدہ لکھنؤ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے پیش کیا تھا اور اس میں فرمایا تھا کہ: ادب تو ادب ہی ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو یا کسی آسمانی صحیفہ میں ہو اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، اطمینان، لطف اور قبولیت کی فضا پیدا کرے، حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے بلبل کو آپ پابند نہیں کرسکتے کہ اس پھول پر بیٹھے، اس پھول پر نہ بیٹھے لیکن کہاں کا حسن مذاق اور یہ کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمود اور اپنی جلوہ نمائی کے لئے مسجد کا سہارا لیا۔

ہندوستانی رابطۂ ادب اسلامی کے صدر پروفیسر محمد اجتباء ندوی نے کہا کہ صاف ستھرے ماحول کی طرف پیش رفت کے ساتھ ساتھ برادران وطن کے درمیان امن وآشتی اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے ادبی ذوق کی تسکین وتربیت پر مبنی سرگرمیوں کا فروغ ہی اسلامی ادب کا فرض منصبی ہے کہ وہ قومی سطح پر پھیلی ہوئی آوارگی وبے راہ روی کے ازالے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

سکریٹری جنرل پروفیسر شفیق احمد خاں نے رابطۂ ادب اسلامی دہلی کی گذشتہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جن موضوعات پر اب تک یہاں ادبی نشستیں ہوچکی ہیں ان میں افسانوی ادب سماجی اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ، ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی دل کشی، شبلی نعمانی کا اسلوب نگارش، شفیق جونپوری کی شاعری، ابن فرید کی تنقیدی بصیرت، نشور واحدی کا بانکپن، ہندی کہانیوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، کلیم عاجز کی غزل گوئی، اقبال اور شوقی کی اندلسیات کا موازنہ جیسے موضوعات قابل ذکر ہیں۔

جناب منظر سبحانی صاحب، مجلس صحافت ونشریات دفتر "تعمیر حیات" کے نسبتی بھائی عبد السلام صاحب کا گزشتہ ۱۰ ستمبر بروز چہار شنبہ پانچ بجے شام کرجی ہولی فیملی ہاسپٹل پٹنہ میں مختصر علالت کے دوران انتقال ہوگیا (إنا للہ وإنا الیہ راجعون) ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء بروز پنجشنبہ بعد نماز ظہر جامع مسجد صاحب گنج میں حضرت مولانا سید شاہ محفوظ الباری صاحب قادری نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک تھے اور آبائی قبرستان کریم چک میں سپرد خاک کیے گئے۔ مرحوم عبد السلام نہایت ہی نیک طینت، نیک صورت، نیک سیرت، نیک دل اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے، جناب سید شرف الدین صاحب کے چھوٹے بھائی ورشالیماری ہوٹل کے ایک مالک تھے۔ دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

بصائر وعبر

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی
(مقیم ابوظبی)

تعلق مع اللہ

حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی ایک خاص صفت اعتماد علی اللہ تھی، کسی بھی موقع پر کیسا ہی حادثہ اور اشکال پیش آتا تو کبھی ہراساں نہ ہوتے تھے، بلکہ اسی وقت قلب کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیتے اور غیر اللہ سے ایک دم اتنے بیگانہ ہوجاتے کہ گویا اس کے ساتھ انہیں کبھی تعلق تھا ہی نہیں، چنانچہ ایک شب حضرت ممدوح کو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ سوتے سے جاگ گئے ہیں اور بہت ہی مضمحل حالت میں ہیں، اہلیہ محترمہ نے سبب پوچھا تو فرمایا:

"مجھے ابھی ابھی قلب کا ایک شدید دورہ پڑا جس سے میں سمجھا کہ شاید میرا آخری وقت آچکا ہے۔"

"پھر آپ نے مجھے آواز دے کر جگا کیوں نہ لیا؟" اہلیہ نے فرط حیرت سے پوچھا۔

"معاذ اللہ" حضرت نے غایت اطمینان و اعتماد کے ساتھ فرمایا "ایسے وقت میں، میں تمہیں جگاتا یا اپنے اللہ کو یاد کرتا، میں نے تو اسی آن سارے تعلقات سے قلب کو فارغ کرکے صرف حق تعالیٰ کی طرف توجہ کی، اور دعا و استغفار میں مشغول ہوگیا۔" (حکایات الاسلاف/۷۵)

اسٹالن کی موت اور بیٹی کی توبہ

مارشل اسٹالن تاریخ کے پہلے ملحدانہ نظام کا سربراہ تھا، اس کو تیس برس تک انتہائی مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملا، مگر اس کی موت ایسے حالات میں ہوئی کہ اس کی اکلوتی بیٹی سو پلانا نے الحاد چھوڑ کر مذہبی زندگی اختیار کرلی، اسی سو پلانا نے لکھا ہے کہ:

"میرا باپ ایک نہایت مشکل اور بھیانک موت مرا، ہیمورج (Hemorrhage) آہستہ آہستہ اس کے دماغ کے بقیہ حصوں میں پھیل رہا تھا، اس کا چہرہ بدل گیا اور کالا ہوگیا، اس کے ہونٹ بھی سیاہ پڑگئے تھے، اس کی شکل تک پہچاننا مشکل ہوگئی، موت کی تکلیف نہایت ہولناک تھی، دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا گلا گھونٹا جارہا ہو۔"

سو پلانا اسٹالن نے آگے مزید لکھا ہے کہ:

"بالکل آخری لمحات میں میرے باپ نے آنکھ کھولی اور کمرے میں ہر شخص پر ایک نظر ڈالی اس پر دہشت طاری تھی، ایک سکنڈ میں اس نے تمام لوگوں پر نظر کو گھمایا، تب ہی اچانک ایک ہولناک اور ناقابل فہم واقعہ پیش آیا۔"

"اس نے اچانک اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا جیسے وہ اپنے اوپر کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا، اشارہ خوف سے بھرا ہوا تھا کوئی شخص سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس سمت میں یا کس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا، اگلے لمحے ایک آخری کوشش کے بعد جھٹکا ہوا اور اس کے جسم سے جان نکل گئی۔"

سو پلانا کے ذہن پر اس موت کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے اپنے باپ والی الحادی زندگی چھوڑ کر مذہبی طرز زندگی کو اختیار کرلیا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

مومن کا شیوہ وفاداری ہے غداری نہیں

اسلامی تاریخ میں ایسی روشن مثالیں بھی موجود ہیں کہ جہاں عہد کی خلاف ورزی کا شبہ بھی ہوگیا تو سارا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا، اس کی ایک مثال حضرت امیر معاویہؓ کا یہ واقعہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ نے روم کی حکومت سے جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، ابھی جنگ بندی کے معاہدہ کی معیاد ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس دوران حضرت امیر معاویہؓ نے سوچا کہ اس مدت کے اندر اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جاکر ڈال دوں تاکہ جنگ بندی کی مدت پوری ہوتے ہی حملہ کردیا جائے، چنانچہ امیر معاویہؓ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور حملہ کے لئے تیار ہوگئے اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدہ کی تاریخ پوری ہوئی امیر معاویہؓ نے لشکر کو حملہ کا حکم دے دیا، دشمن اس کے لئے تیار نہ تھا، اس لئے مسلمانوں کو ہر طرف سے فتح حاصل ہورہی تھی، اور اسلامی فوج فتوحات کرتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی۔

اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک شہسوار دوڑا آرہا ہے، جب سوار قریب آیا تو اس نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا "قفوا عباد اللہ قفوا عباد اللہ" (اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ) جب وہ سوار قریب آیا تو دیکھا کہ حضرت عمرو بن عبسہؓ ہیں، حضرت امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ "وفاء لا غدر وفاء لا غدر" یعنی مومن کا شیوہ وفاداری ہے غداری نہیں ہے، حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، اس پر حضرت عمرو بن عبسہؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا:

"جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو وہ اس کی معینہ مدت تک نہ تو اسے توڑے اور نہ اس میں تبدیلی کرے جب تک اس کی مدت گزر نہ جائے یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کردے کہ ہم نے وہ معاہدہ ختم کردیا، لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کی سرحد پر لے کر فوجوں کو ڈال دینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ (یعنی امیر معاویہؓ) کے لیے جائز نہیں تھا۔"

حضرت امیر معاویہؓ نے جب یہ سنا تو حکم دیا کہ جتنا علاقہ اس وقت فتح کیا گیا ہے وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا اور اپنی سرحد پر واپس آگئے۔" (ترمذی ابواب سیر باب ما جاء فی الغدر

حدیث/۱۶۲۹)

ایثار و ہمدردی کا ایک انوکھا واقعہ

خطیب بغدادی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ بغداد'' میں علامہ واقدی کے حالات میں لکھا ہے:

''واقدی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مجھے بڑی مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، فاقوں تک نوبت پہونچ گئی، گھر سے اطلاع آئی کہ عید کی آمد آمد ہے، اور گھر میں کچھ بھی نہیں، بڑے تو صبر کرلیں گے، مگر بچے مفلسی کی عید کیسے گزاریں گے، یہ سن کر میں اپنے ایک تاجر دوست کے پاس قرض لینے گیا، وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا اور بارہ سو درہم کی ایک سربمہر تھیلی میرے ہاتھ میں تھمادی، میں گھر آیا، ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میرا ایک ہاشمی دوست آگیا، اس کے گھر بھی افلاس وغربت نے ڈیرہ ڈالا تھا، وہ مجھ سے کچھ رقم قرض چاہتا تھا میں نے اندر گھر میں جاکر اہلیہ کو قصہ سنایا کہنے لگی:

''کتنی رقم دینے کا ارادہ ہے؟'' میں نے کہا'' تھیلی کی رقم نصف نصف تقسیم کرلیں گے اس طرح دونوں کا کام چل جائے گا''

''بڑی عجیب بات ہے'' میری بیوی قدرے غصہ ہوکر کہنے لگی۔'' آپ ایک عام آدمی کے پاس گئے اس نے آپ کو بارہ سو درہم دیئے، اور آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا ایک شخص اپنی حاجت لے کر آیا ہے اور آپ اسے ایک عام آدمی کے عطیہ کا نصف دے رہے ہیں۔ آپ اسے پوری تھیلی دے دیں۔''

چنانچہ میں نے وہ تھیلی کھولے بغیر سربمہر اس ہاشمی کے حوالے کردی، وہ تھیلی لے کر اپنے گھر پہونچا تو اسی اثناء میں میرا تاجر دوست (جس نے وہ تھیلی مجھے عطیہ دی تھی) اس ہاشمی کے گھر آگیا اور کہنے لگا:

''عید کی آمد آمد ہے اور میرے گھر میں کچھ نہیں، کچھ قرض رقم چاہئے۔''

میرے ہاشمی دوست نے وہی تھیلی (جو میں نے اسے دی تھی) سربمہر اس تاجر دوست کے حوالے کردی۔''

اپنی ہی تھیلی اسی طرح سربمہر دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ماجرا کیا ہے؟ چنانچہ وہ اس تھیلی کو ہاشمی دوست کے یہاں چھوڑ کر میرے پاس آیا، میں نے اسے پورا قصہ سنایا، در حقیقت تاجر دوست کے پاس بھی اس تھیلی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، اس نے ساری رقم مجھے دے دی تھی اور خود قرض لینے ہاشمی دوست کے پاس چلا گیا، اور جب ہاشمی نے وہی تھیلی اس کے حوالے کرنی چاہی تو سب راز کھل گیا۔

ایثار و ہمدردی کے اس بے مثال واقعہ کی اطلاع جب وزیر یحییٰ بن خالد کو پہونچی تو وہ دس ہزار دینار لے کر میرے پاس آئے، اور کہنے لگے:

''اس رقم میں دو ہزار آپ کے، دو ہزار تاجر دوست کے اور چار ہزار آپ کی اہلیہ کے ہیں کیونکہ وہ تم سب میں زیادہ قابل قدر اور لائق اعزاز ہے (تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۱)

ایسا کہاں سے لاؤں کہ.....

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ امراء سے بہت گھبراتے تھے اور کسی امیر سے ملاقات کا موقع نہیں آنے دیتے تھے، خورجہ کے ایک رئیس برسوں سے تمنا میں تھے کہ میرے گھر پر حضرت والا آجائیں مگر وہ بار بار کی کوشش کے باوجود مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تھے، اتفاق سے جنگ روم و روس چھڑ گئی، اور حضرت نے ترکوں کی اعانت کے لیے چندہ کی تحریک شروع کی، جو اس زمانے میں سلطانی چندہ کے نام سے معروف ہوئی، ان رئیس صاحب کے لیے یہ زریں موقع ہاتھ لگ گیا، انہوں نے کہلوایا کہ اگر حضرت والا ان کے گھر پر تشریف لاکر وعظ فرمادیں تو وہ سلطانی چندہ میں دس ہزار روپے دیں گے، حضرت نے منظور فرمالیا اور ان کے یہاں وعظ فرمایا رئیس نے حسب وعدہ دس ہزار روپے سلطانی چندہ میں پیش کیے۔

مجلس ختم ہوجانے پر حضرت اٹھے تو مجمع بھی اٹھا اور لوگوں میں حضرت کی مہمانی کے بارے میں کہا سنی اور ردو کد ہونے لگی، ہر شخص کی خواہش تھی کہ حضرت کو اپنے گھر لے جاکر مہمان بناؤں، لوگ اس جھگڑے اور بحث میں سرگرداں تھے، اور حضرت اس ہجوم میں سے آہستہ سے نکل کر روانہ ہوگئے، مغرب کا وقت آچکا تھا، اذان بس ہونے والی تھی۔

حضرت والا (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) شہر کے کنارے ایک غیر معروف مسجد میں پہونچے وہاں اتفاق سے امام مسجد موجود نہ تھا، لوگوں میں تشویش ہوئی کہ نماز کون پڑھائے؟ ہر ایک دوسرے پر ٹالتا تھا، چند ایک نے حضرت سے کہا کہ ''بھائی تم ہی نماز پڑھادو'' (یہ لوگ حضرت کو پہچانتے نہ تھے) مگر حضرت عذر فرماتے رہے، جب کوئی بھی امامت کے لیے تیار نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت سے یہ کہکر زبردستی امامت کے لئے مصلیٰ پر ڈھکیل دیا کہ ''بندۂ خدا تو مسلمان تو ہے، کیا تجھے دو چار سورتیں بھی قرآن شریف کی یاد نہیں جو امامت سے اتنا گھبرا رہا ہے۔''

حضرت نے اب مجبور ہوکر امامت کرائی، مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ پہلی رکعت میں تو قل اعوذ برب الناس پڑھ گئے اور دوسری میں قل اعوذ برب الفلق ختم نماز پر اس مسجد کے ان پڑھ نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ عجیب آدمی ہے جس نے قرآن ہی الٹا پڑھ دیا، حضرت نے فرمایا:

''بھائی میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں''

لوگوں نے کہا کہ ''کسی کو کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا''

حضرت نے اس پر فرمایا کہ ''مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز تو اس طرح بھی ہوجاتی ہے'' اس پر لوگوں نے تند لہجہ میں کہا کہ ''چوری اور سینہ زوری'' ایک تو نماز الٹی پڑھادی اور اوپر سے مولویوں کو بھی بدنام کرتا ہے۔''

یہاں یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انہوں نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کررہے ہو، یہ تو مولانا محمد قاسم ہیں۔'' (سوانح قاسمی ص ۳۹۵)

❁❁❁

فکر ابوالحسن علی ندوی

یادوں کے دریچے سے

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی ایک یادگار تحریر

حضرت مولانا علی میاں اور میری عمر میں ۱۸ سال کا فرق تھا تقریباً ۵۳ سال کی رفاقت رہی خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے لے کر انتقال کے وقت تک، میری طالب علمی کا ابتدائی دور ہائی اسکول تک پرتاب گڈھ میں گذرا، ابتدائی دور میں میرے مربی اور استاد مولوی عبید الرحمٰن صاحب مرحوم گورنمنٹ ہائی اسکول پرتاپ گڈھ میں اردو و عربی کے استاد تھے، ان کی شخصیت میں عجیب دلآویزی اور مقناطیسیت تھی، ہندو مسلمان کی کوئی قید نہیں تھی جس کا بھی ذرا ان سے رابطہ ہوجاتا اس میں صلاح خیر کا عنصر ابھر آتا، مسلمان لڑکے نماز کے پابند ہوجاتے، ہر شخص ان کا احترام کرتا ان کی نجی زندگی میں سادگی، سخاوت اور سنت نبوی کی جھلک بہت نمایاں تھی، اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق بہت نمایاں تھا، استاد اور شاگرد کا براہ راست تعلق تو مشکل سے چھ مہینے رہا ہوگا لیکن ان سے مسلسل رابطہ اور رہنمائی کا سلسلہ بہت بعد تک رہا ان کا حال یہ تھا کہ جس شہر میں جاتے نوجوانوں میں دینی تعلق بڑھ جاتا، ان کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کو خصوصیت سے تجارت کی طرف راغب ہونا چاہئے، وہ خود بھی اس کام کو کرکے دکھاتے تھے، اس پس منظر کے ریکارڈ پر لانے کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہوسکے مولوی عبید الرحمٰن صاحبؒ کا خیال تھا کہ آزادی کے بعد جبریہ تعلیم کا نفاذ ہوگا، اس کے اس احساس کا نتیجہ تھا کہ ہماری نوجوانوں کی تنظیم جس کا نام ''اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' تھا اس نے لڑکے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا شہر میں ایک ایک گھر کا سروے کیا ایک دارالمطالعہ قائم کیا جو تنظیمی کاموں کا مرکز تھا، دراصل یہ میری سرگرمیوں کا آغاز تھا جس کے نتیجہ میں شہر میں ایک ممتاز متحرک تنظیم جو دینی تعلیمی اور تعمیری کاموں میں سرگرم تھی وجود میں آگئی، شہر کے نوجوانوں کو فجر کی نماز سے پہلے بیدار کرنا، صبح کی نماز میں یہ نوجوان شریک ہوتے اور کچھ ورزش کرکے دار المطالعہ سے کتاب لے کر اپنے گھروں کو واپس ہوجاتے عصر کے وقت پھر یہی نوعیت ہوتی، شہر میں اکثر جلسے ہوتے اور عیدین کے موقع پر ہی تعلیمی اداروں کے لئے چندہ جمع کیا جاتا تھا۔

مقامی سی۔آئی۔ڈی نے یہ رپورٹ دیدی، یہ چندہ جمع کرکے قاسم رضوی کی تنظیم اتحاد المسلمین حیدر آباد کو بھیجا جاتا ہے اور بھی ایسے ہی بے بنیاد الزام اس نے تراشے، یہ کہ ۱۵ اگست کو جھنڈا جلوایا وغیرہ، تفتیش بھی ہوئی لیکن بات بالکل بے بنیاد تھی اس لئے اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس درمیان کسی شخص نے مجھے متوجہ کیا کہ لکھنؤ میں مولانا علی میاں ہیں ان سے ملوں، لکھنؤ میرا آبائی وطن بھی ہے میں نے لکھنؤ جاکر مولانا سے ملاقات کی، یہ پہلی ملاقات ظہر کے وقت محمد علی لین کی مسجد میں ہوئی، نماز کے بعد مولانا نے میری روئداد اطمینان سے سنی سب کچھ سن کر ایک جملہ کہا کہ'' کچھ دن ساتھ رہنے کی ضرورت ہے'' پھر کہا کہ صبح آجاؤ تو مولانا منظور نعمانی صاحبؒ سے ملوادوں، وہ مولوی گنج میں ذرا اندر کے حصے میں رہتے تھے ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت اللہ والی شخصیت ہے، جیسے انوار کی بارش ہورہی ہے، میں نے اپنے کام کی پوری تفصیل انھیں بھی سنائی، مولانا نے اطمینان سے پوری بات سن کر یہ کہا کہ ''اگر کسی شہر میں تم یہ نظام قائم کردو تو ہم اسے اپنالیں گے'' میں نے عرض کیا کہ ہم تو طالب علم ہیں جو ہم سے ہوسکا کیا یہ تو بڑوں کا کام ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا علی میاں ۳۲ آدمیوں کی ایک تبلیغی جماعت لے کر پرتاب گڈھ آئے، جماعت جامع مسجد میں ٹھہری ایک پرچہ کے ذریعہ مجھے گھر پر اطلاع کرائی کہ ہم آگئے ہیں، میں فوراً جامع مسجد گیا اور طلبا کی ٹیم کو بلا کر ان کے ذمہ تمام کام سپرد کردیئے، یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا افطاری کھانا، سحری ہر چیز کا نظام بن گیا، عصر کے وقت مولانا نے فرمایا کوئی سائیکل مل جائے گی میں نے ایک صاحب سے پرانی سائیکل لے کر دی، اس کے ذریعہ وہ پہلی مرتبہ میرے والد صاحب سے ملنے گئے، والد صاحب مرحوم ڈاکٹر محمد کرامت حسین قریشی شہر کی ممتاز ترین شخصیت تھی، مجھے ایسے کسی کام سے منع نہیں کرتے تھے، علماء کا اکرام کرتے تھے، یہ حضرت مولانا سے ان کی پہلی ملاقات تھی۔

حضرت مولانا نے تراویح کے بعد جماعت میں شامل ایک ممتاز شاعر سے مسجد میں ہی فرمائش کی کہ یہ نوجوان ہیں ان کو اقبالؒ کے اشعار سنائیں میں نے ادھر ادھر دیکھا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ مسجد والے کیا کہیں گے رمضان المبارک میں مسجد میں شاعری ہورہی ہے لیکن مولانا بالکل مستغنی کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد لوگ آرام کرنے لیٹ گئے، صبح شہر کے بہت سے لوگ فجر کی نماز میں جمع ہوئے انھیں حضرت مولانا نے خطاب کیا کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، اس طرح حضرت مولانا تین بار پرتاپ گڈھ تشریف لائے حضرت مولانا نے آخر میں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے یہاں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، پھر ہمارے ایک ساتھی ہاشم جو نویں درجہ کے طالب علم تھے اس کام سے وابستہ ہوگئے پھر تبلیغی جماعت کے کام کو بہت فروغ ہوا نوجوان طبقہ متوجہ ہوگیا ہر مسجد میں توسیع ہوئی اور پورے ضلع میں کام پھیل گیا، ایک مرتبہ شہر کے مضافات کٹرہ اور ایک مرتبہ متوآئمہ کا سفر ہوا چالیس نوجوان ساتھ میں تھے، متوآئمہ قصبہ میں عجب ویرانی تھی مسجد بہت شاندار، نمازی کوئی نہیں، دوپہر میں دو پتیلیاں مانگ کر دال چاول پکوائے اور مسجد کے فرش کو دھوکر اسی پر کھانا کھایا، بعد عصر کے بعد دیکھا مولانا مسجد کے صحن میں ٹہل رہے ہیں۔

اور روتے جاتے تھے، کنڑہ میدنی گنج پرتاپ گڈھ کے سفر میں وضو کر کے اٹھنے لگے تو کہا میں بوڑھا ہو گیا ہوں حالانکہ اس وقت چالیس سال کی عمر ہوگی، کتاب پڑھی گئی مولانا ثانی مرحوم بھی تھے، انھوں نے دعا کرائی، دعا میں ایسی رقت طاری ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا دو چار کا انتقال ہو جائے گا، ایسی کیفیت کبھی دیکھی نہیں۔

۱۹۴۸ء میں راقم کی تحریک پر مجلس اسلامیات کے سکریٹری نے حضرت مولانا علی میاں کو علی گڈھ یونیورسٹی آنے کی دعوت دی، مولانا رابع حسنی ندوی ساتھ تھے، یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں جو کبھی پروفیسر حلیم پروواٹس چانسلر کا مکان تھا اس میں قیام رہا، یونین میں مولانا نے تقریر کی راقم کو مختلف ہالوں میں مولانا کا طلبا سے تعارف کرانے کی سعادت حاصل ہوئی نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سے اسٹریچی ہال کے باہر مولانا سے ملاقات ہوئی تو نواب صاحب نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے یہاں ایک حبیب بھی رہتا ہے پھر مولانا ان کی کوٹھی حبیب منزل میرس روڈ منتقل ہو گئے دراصل وہ مولانا کے والد مولانا عبدالحئیؒ کے رفیق خاص تھے انتہائی ذی علم اور مولانا آزاد کے مخصوص دوستوں میں اور ان کے میزبان تھے، نہایت وجیہہ صورت، چہرہ بے حد نورانی، مولانا نے میرا بھی تعارف کرایا بہت ہی شفقت سے میرے چہرہ پر ہاتھ پھیرا۔

اس کے بعد علی گڈھ سے دہلی کا سفر ہوا، نظام الدین کے شاہ حسن عطا سکریٹری مسلم یونیورسٹی یونین، میں اور میرے ایک ساتھی عباد صاحب ساتھ تھے، یہ تبلیغی سلسلہ کی پہلی جماعت تھی جو نظام الدین گئی، نظام الدین کی مسجد میں مولانا یوسفؒ سے ملاقات ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ جامعہ کے ۵۲ سیئر طلبا میں مشکل سے دو دینی ذہن کے ہیں باقی ۵۰ ترقی پسند یا دوسرے الفاظ میں کمیونسٹ ذہن کے طلبا ہیں۔

مولانا سے تعلق تو مسلسل رہا، لیکن تعلیم کی وجہ سے لمبا وقفہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں میرا ڈھاکہ میڈیکل میں داخلہ ہو گیا مجیب الرحمٰن نے ۱۹۵۱ء میں اردو، بنگالی کا قضیہ کھڑا کیا، حکومت پاکستان کی انتظامیہ نے گولی چلائی چار نوجوان مر گئے، اس کے بعد حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے، میرا صرف تعلیم کے لئے ڈھاکہ بدرجہ مجبوری جانا ہوا تھا وہاں مستقل رہنے کا ذہن نہیں تھا میں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا، لوگوں نے منع کیا میرا جواب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو روزی مقرر کی ہے وہ تو ملے گی دوسرے سب نوجوان پاکستان چلے جائیں گے تو ہندوستانی مسلمانوں کا کیا ہوگا، اس لئے واپس آ گیا، لکھنؤ میں ہومیو پیتھک کالج میں داخلہ لیا، فائنل کے بعد لندن پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے چلا گیا واپس آ کر اسی کالج میں بحیثیت سینیر لکچرر ملازمت مل گئی، ۱۷ سال پڑھانے کے بعد ایک اہم واقعہ کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا، استعفیٰ دینے کی جو خوشی اس وقت ہوئی وہ نوکری ملنے کے وقت بھی نہیں ہوئی تھی، سب سے پہلے مرکز کچہری روڈ جا کر مولانا محمد میاں کو خوشخبری سنائی، ملازمت کا یہ دور ۱۹۵۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۳ء پر ختم ہوا، دراصل جذبہ یہ تھا کہ ابھی صحت ٹھیک ہے کچھ کام ہو جائے گا ورنہ صرف آرزو ہی رہے گی کہ صحت ٹھیک ہوتی تو یہ کرتا وہ کرتا، حالانکہ سرکاری ملازمت گزیٹڈ ہونے کے باوجود میرے کسی کام میں رکاوٹ نہیں تھی تمام کاموں میں سرگرمی سے شرکت کرتا رہا۔

اسی زمانہ میں ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی، ۱۹۶۲ء میں ندائے ملت شائع ہونا شروع ہوا، ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی حکومت کی تحویل میں چلی گئی، ۱۹۶۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے یوپی مشاورت نے ڈاکٹر فریدی اور ان کے رفقاء کے ایماء پر یوپی میں کانگریس حکومت کے خلاف ووٹ ڈالنے کی تحریک چلائی گئی کانگریس حکومت ٹوٹ گئی، مولانا کی فکر ان تمام مسائل میں پوری طرح حاوی تھی، میں ہر مرحلہ پر پوری طرح اس میں شریک تھا، بعد میں ۱۹۶۷ء میں رامپور میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بعض اراکین نے فریدی صاحب سے یہ کہا کہ مشاورت غیر سیاسی جماعت ہے اس لئے اگر سیاست کرنی ہے تو علیحدہ تنظیم قائم کر لیجئے، مولانا بہر حال میں ڈاکٹر فریدی صاحب کے حق میں تھے، مشاورت کے اسی اجلاس میں میں نے تعمیری منصوبہ پیش کیا جو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا، ۱۹۶۷ء میں لکھنؤ میں مسلم مجلس قائم ہوگئی ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۶۲ء میں مولانا کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی اور اسی سفر میں رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا، شاہ سعود کی موجودگی میں ۱۹۶۳ء میں مولانا کا سفر یورپ اور انگلینڈ کا ہوا، میں رفیق سفر تھا، واپسی میں اندلس کا دورہ تھا، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، میڈرو وغیرہ مقامات پر خصوصیت سے جانا ہوا، یہ ایک تاریخی یادگار سفر تھا ہر جگہ تاریخی عمارتوں پر "ولا غالب الا اللہ" لکھا ہوتا تھا، ہوٹل اندلس کی ایک شب یادگار تھی ذکر جہری مولانا نے شروع کیا علیحدہ علیحدہ کمروں میں، مولانا نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا روحیں لپٹی جا رہی ہیں، عجب کیفیت تھی، جمعہ کا دن تھا میں نے عرض کیا آج جمعہ پڑھ لیا جائے، چند اخوانی نوجوان بھی تھے ۲ صدیوں کے بعد شاید یہ پہلا جمعہ تھا مولانا نے خطبہ دیا نماز پڑھائی، مسجد قرطبہ میں بھی دو رکعت نماز پڑھی گئی اس میں اندر ۵ گرجے بنے ہوئے تھے لندن کے سفر میں آکسفورڈ، کیمبرج اور دوسرے تاریخی مقامات کے ساتھ انڈیا لائبریری بھی جانا ہوا، پروفیسر آربری سے ملاقات ہوئی، انہوں نے اپنی لائبریری دکھائی کہ یہ سات سو برس پرانی ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی کے مختلف شعبے دیکھے میوزیم دیکھے، پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے سوڈان یونیورسٹی دکھائی، ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، اسے پڑھ کر کثرت سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے اس وقت ۲۰ ہزار نسخے دو مرتبہ چھپ چکے تھے سوڈان کے موجودہ اسپیکر حسن ترابی نوجوان تھے اور آج کل صدر جنرل بشیر ابوبکر کی طرح انتہائی اہم دینی شخصیت ہیں، اس زمانہ

میں سوبورن یونیورسٹی میں قانون کے طالب علم تھے، مولانا سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، ہر جگہ اخوانی نوجوان جو مولانا کی کتابوں کے ذریعہ اس سے واقف تھے انتہائی گرویدگی کا مظاہرہ کرتے تھے برابر ساتھ ساتھ رہتے تھے، سوبورن یونیورسٹی کے اخوانی نوجوان سے بھی مولانا نے خطاب کیا۔

جینوا میں ڈاکٹر سعید رمضان جو شیخ حسن البنا کے داماد اور شعلہ بیان مقرر اور ممتاز قانون داں تھے جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، وہی دراصل اس سفر کے داعی اور میزبان تھے، جینوا Geneval میں مولانا کی والدہ کی علالت کی خبر ملی، ان کا اصرار تھا کہ مولانا کچھ دن اور قیام کریں صحت کے خیال سے یہ بھی کہا کہ راقم بریلی چلا جائے اور والدہ کی خیریت معلوم کر کے آجائے، لیکن مولانا کا جواب والدہ سے والہانہ تعلق تھا اس کے لئے راضی نہیں ہوئے، مولانا کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مولانا کہیں ہوں والدہ کی علالت سن کر پھر نہیں رکتے تھے اور اکثر سفر بھی ملتوی کر دیتے تھے، اس زمانہ میں عبدالرؤف صاحب سوئزرلینڈ میں ہندوستان کے سفیر تھے، انہوں ہی نے مولانا کا ایئرپورٹ پر استقبال کیا، بڑی اپنائیت کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے، کھانا کھلایا سوئیس قوم کی نظام تعلیم کی گرانی اور قومی کردار کے دوسرے دلچسپ قصے سناتے رہے۔ مولانا کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی خود ہی جا کر ان کی تصویر کھنچوادی چھٹی ہونے کے باوجود دوسرا پاسپورٹ بنوا کر دیا۔

مولانا کے سفرنامے ہمیشہ بہت مقبول ہوئے امید تھی کہ یہ بھی منظر عام پر آئیگا لیکن پتہ نہیں کیوں ابھی تک شائع نہیں ہو سکا، جینوا Geveva کے قیام میں یورپ کے مختلف شہروں میں مقیم بہت سے نوجوان آگئے تھے، یحییٰ اسلام سے بہت تعلق رکھتے تھے، اکثر یہ لوگ ننگے سر نماز پڑھتے، مولانا سے ایک مرتبہ کہا کہ کبھی کبھی ہم ننگے سر نماز پڑھ لیا کریں اور آپ ٹوپی پہن کر، مولانا کا دراصل اصلاح کا یہی دل آویز طریقہ تھا، کبھی جارحیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا، لوگوں نے اس کا بہت اثر لیا، سعید رمضان جب پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے تھے تو مولانا نے ان کا زبردست استقبال کیا تھا، گنگا پرشاد میموریل ہال میں انھوں نے زبردست تقریر کی تھی، مولانا نے خصوصیت سے ان کا تعارف کرایا تھا، حالانکہ وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور سوٹ میں تھے جو مصری تعلیم یافتہ نوجوانوں کا عام لباس تھا، بعد میں حکومت ہند کو سعید رمضان مرحوم سے کچھ شکایت یا غلط فہمی ہو گئی تھی تو وہ ان کی آمد پر بہت نظر رکھتی تھی بعض وقت مضحکہ خیز نوعیت پیش آئی کہ وہ لکھنؤ پہنچ کر ۳۷ گرگوئن روڈ پر چھپے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ندوہ کا تاریخی اجلاس تھا ایمرجنسی اور اندرا گاندھی کا دور تھا، دعوت نامہ تو چلا گیا اجلاس کی تاریخیں قریب آگئیں لیکن مہمانوں کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں آ رہی تھی، مولانا خاموشی سے رکشہ پر ٹیلہ والی مسجد گئے وہاں انتہائی عاجزی سے دعا کی عین اجلاس کے وقت پھر تو ایسا اژدحام ہوا کہ یہ اجلاس یادگار بن گیا، انتظامی امور اور شہری استقبالیہ کا انچارج میں تھا، ایک اجلاس کے موقع پر بھیڑ بہت تھی مہمانوں کو کارک اودھ پہونچانا تھا خیال تھا کہ اجلاس ختم ہونے سے پہلے جب کہ بھیڑ نہیں ہوگی مہمانوں کو پہونچا دیا جائے، ورنہ گاڑیوں کا نکلنا مشکل ہو جائے گا ان کی سیکورٹی کا بھی مسئلہ تھا، لیکن مولانا نے اچانک جلسہ کے اختتام کا اعلان کر دیا، میں عجلت سے مولانا کے پاس ڈائس پر پہونچا کہ ذرا توقف کر لیا جائے، لیکن جو بات میں نے محسوس کی جیسے کوئی بھٹی دہک رہی ہو اور مولانا بالکل مطمئن اور صورتحال سے بالکل غیر متاثر، مولانا کی یہ بات میں نے اکثر موقع پر دیکھی خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ اور توکل اور حالات سے بالکل غیر متاثر اور بے نیاز وہ اکثر اہم موقع پر چند لوگوں کو خاص طور پر صوفی انیس کو جو مجذوب صفت تھے مسجد میں بٹھال دیتے تھے کہ یکسو ہو کر ذکر میں مشغول رہیں، ندوہ کے اس اجلاس میں جو بات محسوس کی گئی جیسے سکینت کی چادر تنی ہو۔

مولانا کے وہاں اسفار میں کھانے پینے اور سفر خرچ کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا کہ کھانے پینے کی چیز رکھی جائے، اس طرح اکثر ایک ہی وقت جو سامنے پڑا اس کو کھانے پر مدعو کر لیا منتظمین کو اندازہ رہتا تھا کہ کھانا کم ہے یا گوشت کم ہے یا مرغ ایک ہی ہے، مولانا کو اس تحقیق کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن دیکھا بھی گیا کہ کھانا بچ ہی رہا کوئی بھوکا نہیں رہا، لوگ خوب کھاتے بھی تھے، اور کھانے میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے خاص طور پر جب کھانا مولانا کے گھر کا ہوتا تھا خواہ دال روٹی ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں تو بہت پر جوش تھے لیکن براہ راست روک ٹوک اور تنقیص کی عادت نہیں تھی اس لئے ہر قسم کے لوگ مولانا کی مجلس میں ہوتے ملاقات کرتے اور ہر قسم کی ضرورت کی درخواست بھی کرتے ایک مرتبہ مولانا کے دیوبند کے ایک ساتھی نے مولانا سے دریافت کیا کہ مولانا آپ تقریر کس طرح تیار کرتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ تقریر سے پہلے کچھ نہیں معلوم کہ کیا کہنا ہے، یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ "اللہ تعالیٰ اس ٹھیکری میں کچھ ڈال دے۔"

مولانا اپنے بزرگوں کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خود سے گفتگو بھی نہیں کرتے تھے گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے تھے، ان بزرگوں نے کچھ بھی پوچھا تو موقر جواب دیا، حضرت رائے پوری کے بعد مولانا کی تمام توجہ کا مرکز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تھے، ہر مسئلہ میں مشورہ کرنا خواہ خطوط کے ذریعہ یا کسی کو بھیج کر یا حاضر ہو کر سیاسی مسائل ہوں یا دینی مسائل ہوں، مشاورت کی الجھنیں ہوں یا ملکی یا غیر ملکی مسائل ہوں، یوپی کی مشاورت کی چیئرمینی کا مسئلہ تھا مولانا نے حضرت شیخ سے پوچھا انھوں نے فرمایا فریدی کو بنا دو ۱۹۶۷ء کے بعد مجھے یوپی مشاورت کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا، مجلس تحقیقات دراصل مولانا کی اس فکر کا نتیجہ تھا کہ نوجوانوں میں غیر شعوری طور پر ارتداد بڑھ رہا ہے، اس موقع پر "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" ایک کتابچہ لکھا، دراصل اس سے مزید تحریک ہوئی میں نے اس ادارہ کا

نام تجویز کیا Academy of Islamic Research & Publication ابتدائی رقم میری اور مولانا کے ایک مخلص محمد تقی فاروقی جن کی حیثیت ریلوے کے ایک ملازم کی تھی، اور ایک بڑی رقم یعنی ایک ہزار حیدرآباد کے ایک تاجر الحاج ایم حسین نے بعد میں دی تھی جس کا مولانا بار بار ذکر کرتے تھے، پھر بعد میں ممبئی کے مخیر حضرات سے بار بار رقم حاصل ہوئی، محمد ہاشم محمد توفیق، احمد غریب اور بعض دوسرے حضرات سے ندائے ملت کے لئے بھی بار بار رقم میں ہی ممبئی کے مخلصین سے لاتا رہا۔

مجلس تحقیقات رفتہ رفتہ ایک بڑا ادارہ بن چکا ہے اس کی اپنی عمارت سے مولانا کی اکثر کتابوں کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو کر ان ملکوں میں شائع ہو رہے ہیں، غیر ممالک میں مولانا کے تعارف کا ذریعہ زیادہ تر ان کی کتابیں تھیں، علمی حلقوں اور نوجوانوں میں ان کا بڑا استقبال پہلے بھی تھا، حافظہ بے حد قوی تھا، تاریخ دعوت وعزیمت کی پہلی جلد زیر ترتیب تھی، اتفاق سے میرا اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا رائے بریلی سفر ہوا، مولانا ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بغیر کسی کتاب کے حوالے کے لکھ رہے تھے، مولانا منظور نعمانی صاحب نے بڑی حیرت سے اظہار کیا اور کہا بھی مولانا آپ کیسے کتاب لکھتے ہیں مولانا کے ساتھ طویل رفاقت اور سفر و حضر میں کثرت سے ساتھ ہوا۔

مولانا، گاندھی اور پنڈت نہرو کے بعض شریفانہ کردار کے معترف تھے۔ اور راجیو گاندھی نے شاہ بانو کیس میں مولانا کے موقف کی جس طرح تائید کی تھی اس کے لئے اپنی تقریروں میں اکثر اس کا تذکرہ کرتے تھے، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر کے مسئلہ میں مولانا کا طرز عمل انتہائی والہانہ تھا، یوں تو علماء کے طبقہ میں ان کا تعلق بہت وسیع تھا، لیکن مولانا الیاس صاحبؒ سے بے حد تعلق رکھتے تھے، لیکن بیعت کا خصوصی تعلق حضرت رائے پوری سے تھا، انتقال سے چند روز پہلے میں نے سوال کیا کہ اس دور میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ بالغ نظر عالم دین کون تھا، اس پر انھوں نے فرمایا حضرت رائے پوری کی مثال گنا جیسی ہے جہاں منھ لگائے مٹھا، مولانا کا معمول تھا کہ جب بھی سفر کرتے، جانے سے پہلے اور آنے کے بعد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے، مشورہ بھی کرتے اور روئداد بھی سناتے۔

مولانا نے ایک مرتبہ لکھا کہ جب تک امریکا میں اسلامی انقلاب نہیں آئے گا خلیج اور سعودی عرب میں نہیں آئے گا اس لئے کہ یہ ملک ہر چیز وہیں سے اخذ کرتے ہیں، مولانا تمام زندگی بیچ دھارے میں رہے، مسائل سے براہ راست نمٹتے تھے لیکن خاموشی سے، اور جو جس کام کا اہل ہوتا اس کو آگے بڑھاتے، خود نمائی سے احتیاط کرتے، شہرت سے اجتناب کرتے خود کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتے، اپنی شخصیت کا اخفا بہت تھا، کہیں سے کسی قسم کی بزرگی کا اظہار نہیں ہوتا، دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے، کسی نے معمولی سی بھی خدمت کر دی تو اسے ہمیشہ یاد رکھتے، کوئی چیز خود ان کے پاس ہوتی تو عنایت فرماتے، سفر میں شگفتگی رکھتے نماز اول وقت میں پڑھتے زیادہ تر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے، معذوری زیادہ ہو جانے کے بعد فرسٹ کلاس یا ایئر کنڈیشن میں سفر کرنے لگے تھے، سفر ہو یا قیام تہجد میں اٹھنے کا معمول تھا عام طور پر ایک خاص کیفیت کے ساتھ یہ شعر پڑھتے

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اکثر بہت گہری سانس لیتے اور کہتے خدایا عاقبت محمود کر دے، اکثر واقعات کی وجہ سے افسردگی طاری ہوتی تو فرماتے کوئی خوشخبری سناؤ چاہے بعد میں تردید کر دینا۔

آخری دنوں میں اہل اغراض کی آمد کچھ زیادہ ہو گئی تھی، اپنے مختلف کاموں خاص طور پر خلیج کے اسفار یا مختلف قسم کی سفارشوں کے سلسلہ میں مولانا سے گذارش کرتے، مولانا کی افتاد طبع یہ تھی کہ شاید ہی کوئی مایوس جاتا، کسی طرح اس کے کام کی ترکیب بن جاتی، اکثر یہ کام مولانا محمد رابع صاحب کو کرنا پڑتا، جہاں تک میرے علم میں ہے اپنی کوئی جائیداد نہیں بنائی جو یافت ہوتی، دوسروں کی نذر کر دیتے، آخر میں بھر بھر کر لوگوں کو دیتے رہے یہ سب کام پورے اخفا سے ہوتا۔

مولانا اپنے تمام کاموں میں دینی تعلیمی کونسل کے کام کو بڑی اہمیت دیتے، اس کی خاطر ہر جگہ سفر کے لئے تیار ہو جاتے، اس تعلق سے اپنے تمام مخصوص اصحاب کا بہت احترام بھی کرتے اور ان کو بے حد عزیز رکھتے۔

دنیائے اسلام میں اہل علم حضرات ہوں یا جو دین اسلام کی نصرت کرنے والے ہوں ان کی برابر فکر کرتے اور بہت تعلق کا اظہار کرتے۔

یہ تحریر مختصر ہوتے ہوئے بھی طویل ہو گئی لیکن ۵۳ رسال کی طویل مدت میں جن واقعات کا عینی شاہد رہا اس کو لکھنا اور دریا کو کوزہ میں بند کرنا آسان کام نہیں ہے امید ہے کہ دوسرے تذکرہ نگار اس کمی کو پورا کریں گے یا پھر کبھی موقع ہو تو واقعات کا تفصیل سے ذکر ہوگا جو بہت اہم ہیں، اور اس وقت لکھنے سے رہ گئے۔

خانوادۂ حسنی و حسینی کو صدمہ

محترمہ سیدہ عائشہ حسینی زوجہ جناب شہاب الدین فریدی صاحب مرحوم کا ۲۱ ستمبر کو دہلی میں صبح ۵ر بجے انتقال ہو گیا، مرحومہ حافظ قرآن تھیں، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء مرحومہ کے پھوپھا تھے، مرحومہ کی والدہ ماجدہ تکیہ کلاں رائے بریلی کے حسنی خانوادہ سے تھیں، مرحومہ اپنے پیچھے سات بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ گئیں، انتقال کے وقت مرحومہ کی عمر ۷۴ برس تھی، ان کے ایک صاحبزادہ احمد کمال فریدی نے ندوۃ العلماء سے حفظ کیا ہے، ادارہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت و بلندیٔ درجات کی دعا کرتا ہے، پس ماندگان کے ساتھ اظہار تعزیت کرتا ہے اور قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اصلاح معاشرہ

عقیقہ سنت ہے

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

ولادت کے ساتویں دن بچہ کا عقیقہ سنت ہے، عقیقہ اس جانور کو کہتے ہیں جسے بچہ کی طرف سے ساتویں، چودھویں یا اکیسویں دن ذبح کیا جاتا ہے، اس کو نسیکہ بھی کہتے ہیں، اسلامی ثقافت کا ایک حصہ ہے، عقیقہ کا اہتمام نہ کر کے ولادت کے چھٹے دن ''چھٹی'' کرنا، غیر اسلامی طریقہ ہے چھٹی کے نام پر عورتوں کا جمع ہونا، اسی روز زچہ و بچہ کو غسل دینا، تیل لگانا اور اس کو عورتوں میں تقسیم کرنا، بچہ کو نیا کپڑا پہنانا، اس کا بال اتروانا، اس کے بعد زچہ عورت، پر لگی ہوئی پابندیوں کو موقوف سمجھنا یہ سب غیر اسلامی اور غیر شرعی باتیں ہیں، ایک مسلمان کو اس سے احتراز کرنا ضروری ہے بلکہ اس کے مقابلہ میں اسلامی طریقہ یہ ہے کہ:

ولادت کے ساتویں دن بچہ کی جانب سے دو بکرے اور بچی کی طرف سے ایک بکری کا لزم کیا جائے، بکرے کے خریدنے میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ ایک سال کا ہو، جس طرح قربانی کے جانور کے لئے سلیم الاعضاء ہونا ضروری ہے، عقیقہ کے جانور میں بھی ان صفات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

عقیقہ میں بکری یا بکرا ذبح کرنا ضروری نہیں ہے۔

عقیقہ میں بکرے کا ذبح کرنا سنت ہے، بڑے جانور کو عقیقہ میں ذبح کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، البتہ حضرت انسؓ سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کے عقیقہ میں اونٹ ذبح کیا تھا، کان یعق عن بنیہ جزوراً'' اپنے بچوں کا عقیقہ وہ اونٹ ذبح کر کے کرتے تھے (مصنف ابی شیبہ) لہٰذا ان بڑے جانوروں کو عقیقہ میں ذبح کیا جا سکتا ہے جن کی قربانی کی جاتی ہے۔

عقیقہ کیوں کرتے ہیں

سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کل غلام رھینۃ بعقیقتہ تذبح عنہ سابعہ'' (ابوداؤد)

ہر بچہ اپنے عقیقہ کا رہین ہوتا ہے، عقیقہ کا جانور ساتویں روز ذبح کیا جائے گا۔

عقیقہ کرنے سے بچہ کی نشو ونما میں جو چیزیں حائل ہوتی ہیں اللہ کے فضل سے دور ہو جاتی ہیں، اولاد سے جو مقصود ہوتا ہے، اس کی ذات سے جو نفع کی امید کی جاتی ہے، اس کی تکمیل کی راہیں وا ہو جاتی ہیں حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ جس بچہ کا عقیقہ نہ ہوا اور اس کا انتقال بچپن میں ہو جائے تو والدین کے لئے وہ بچہ خدا کے حضور سفارشی نہ ہوگا لہٰذا شریعت نے عقیقہ فرض تو نہیں کیا ہے لیکن اندازہ وہ اختیار کیا گیا ہے جس سے خود بخود عقیقہ کرنے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت حسنؓ کی ولادت کے ساتویں روز عقیقہ کیا اور حضرت فاطمہؓ کو حکم دیا کہ بال اتروا کر اس کے برابر چاندی صدقہ کریں۔ (ترمذی)

عقیقہ کا وقت

عقیقہ کا وقت ساتویں دن ہے، اس کے پہلے اگر کوئی کرے تو وہ عقیقہ نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی عقیقہ کی سنت اس سے ادا ہوگی، حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ساتویں دن ممکن نہ ہو تو چودھویں دن، اور اس دن بھی انتظام نہ ہو سکے تو اکیسویں دن کرنا چاہئے، لیکن یہ بھی تحدید کے لئے نہیں ہے، اگر اس دن بھی ممکن نہ ہو تو بعد میں کبھی بھی کر سکتے ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اپنا خود عقیقہ کرے تو وہ بھی کر سکتا ہے اور ظاہر ہے یہ اسی وقت ہوگا جب بچپن میں اس کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو، امام طحاویؒ نے مشکل الآثار (۴۶۱/۱) حضرت انسؓ کے واسطہ سے ایک روایت نقل کیا ہے۔

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن نفسہ بعد مابعث بالنبوۃ

(الطبرانی فی الاوسط (۵۲۹/۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد اپنا عقیقہ خود کیا۔

عقیقہ کے جانور کا خون بچہ کے سر پر نہیں لگائیں گے

بعض لوگ عقیقہ کے جانور کا خون بچہ کے بال اتروانے کے بعد اس کے سر پر ملتے ہیں، اس کو مستحسن خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعق عن الغلام ولا یمس راسہ بدم

(ابن ماجہ (۳۱۶۶) الطحاوی (۴۶۰/۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کا عقیقہ کیا جائے گا مگر اس کے سر پر ذبیحہ کا خون نہیں ملا جائے گا۔

بلکہ ایسا کرنا جاہلیت کا فعل قرار دیا گیا ہے۔

عن عائشۃؓ قالت، کان اھل الجاھلیۃ یجعلون قطنہ فی دم العقیقۃ، ویجعلونہ علی راس الصبی فامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجعل مکان الدم خلوقا (ابن حبان)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں عقیقہ کے جانور کے خون میں روئی ڈبو کر بچہ کے سر پر لوگ ملتے تھے، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کی جگہ ایک قسم کی خوشبو (خلوق) ملنے کا حکم دیا۔

بقیہ: صفحہ ۴۷ پر

تجربات و مشاہدات

کچھ مدیروں اور رسالوں کے بارے میں

جناب عبدالغنی شیخ

قلم کار اور مدیر

مغرب میں ایک معیاری رسالے کو متعدد تخلیقات موصول ہوتی ہیں، انہیں کئی زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے، کچھ مسودے مسلّمہ قلم کاروں کے بھیجے ہوتے ہیں، جن سے مدیر اعلیٰ نپٹ لیتے ہیں۔

دوسرے زمرے کے قلم کاروں کے مسودوں کو اعلیٰ ترین ایجنٹ مدیروں تک پہنچاتے ہیں اور یہ قابلِ اعتنا ہوتے ہیں اور ان کی چھپائی کی طرف سنجیدگی سے دھیان دیا جاتا ہے۔

تیسرے زمرے کے لکھنے والوں کے ایجنٹوں کا اثر و رسوخ کم ہوتا ہے، لیکن مسودے اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

چوتھے زمرے میں گمنام قلم کار شمار ہوتے ہیں، ان کی تخلیقات کو بھی کلی طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے، مدیر ہر اس تخلیق کا خیال رکھتا ہے جسے کسی نے پڑھا ہو۔

پانچویں زمرے میں وہ قلم کار شامل ہیں، جو بلا طلب اپنی تخلیقات رسالے کے مدیر کو ارسال کرتے ہیں۔

ایک معیاری اور اعلیٰ رسالے کو ماہانہ اوسطاً پندرہ سو مسودے اور اسی تناسب سے سالانہ اٹھارہ ہزار مسودے موصول ہوتے ہیں، اس تعداد میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

ذیل میں پچھلی صدی کے پانچ مقبول امریکی رسائل کا ایک سروے ریکارڈ پیش کیا جاتا ہے، جو نیشنل رائٹرز کلب ڈینور، کولوروڈو نے کیا تھا، ان رسائل کو ایک سال میں لگ بھگ ایک لاکھ چالیس ہزار مسودے موصول ہوئے، جن میں ۵۱ ہزار فکشن، ۲۳ ہزار پانچ سو مضامین اور ۶۴ ہزار پانچ سو نظمیں تھیں، مدیروں نے ان تمام مسودوں کو پڑھا اور ۱۲۷ فکشن، ۶۷ مضامین اور ۱۴۱ نظمیں اشاعت کے لئے انتخاب کیں اور ان کے قلم کاروں کو معاوضہ ادا کیا۔

اس سے پہلے ایک جاذب نظر اور دلفریب اشتہار نکالا تھا، جس میں لکھا تھا:

''اپنے فالتو وقت میں لکھ کر خوب روپیہ کماؤ۔''

رسالے کا مدیر بڑا مصروف رہتا ہے اور مسودوں کے انبار میں گھرا رہتا ہے، وہ ہر جگہ مسودے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لئے مدیروں کی غائب دماغی مشہور ہے۔

ایک مدیر اوسطاً روزانہ سات اخبارات اور ماہانہ سو رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتا ہے، رسالے کو کامیاب بنانے اور اس کی فروخت کو بڑھانے کے لئے وہ قارئین کے مزاج اور ذوق کا خیال رکھتا ہے، ایک مشاہدے کے مطابق ایک مدیر اپنے تجربوں سے پندرہ سال بعد اس نکتے کو سمجھتا اور سیکھتا ہے، لیکن کوئی پچاس سال کام کر کے بھی نہیں سمجھتا۔

> تحریر کے مدیر مالک رام نے ایک نکتے کی بات کہی تھی:
> ''سب سے پہلی مشکل تو یہی ہے کہ (اردو میں) تحقیقی اور علمی مضمون لکھنے والے نہیں ملتے، میں نے پہلے دن ایک اصول بنایا تھا کہ مضمون ہر کسی سے طلب نہیں کروں گا مجھے معلوم تھا کہ اگر کسی صاحب نے میری درخواست پر مضمون لکھا اور وہ ہمارے معیار سے کم تر ہو تو دشواری پیدا ہوگی، نہ اسے چھاپ سکوں گا اور نہ اسے واپس کرنے کا موقع رہے گا..... لہٰذا میں نے محض ان صاحبان سے مضمون کی درخواست کی تھی، جن کی اہلیت اور علمی روایت کا مجھے علم اور یقین تھا۔''

ایک قابل مدیر مسلّمہ قلم کاروں کے جذبات اور صلاحیت کا خیال رکھتا ہے، ایک سرکردہ مدیر نے ایف، سکاٹ، فیزجیرالڈ کو لکھا تھا:

''کبھی بھی میرے فیصلے کی طرف نہیں جاؤ... کسی بھی قلم کار کو صرف اپنے لئے لکھنا چاہئے۔''

انگریزی قلم کاروں کے ایک ترجمان Author نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا ہے:

''اگر چہ انگریز ادیبوں کی اکثریت سرکاری سنسر کی زد میں کبھی نہیں آتی لیکن ناشروں، لائبریریوں، کتب فروشوں، ٹیلی ویژن کے افسروں، فلم سازوں اور جریدوں کے مدیروں کے سنسر کی قینچی ہمیشہ چلتی ہے۔''

اعجاز صدیقی ادبی ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیر رہے ہیں، آج ان کے فرزند افتخار امام صدیقی نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے، اعجاز صدیقی مرحوم نے تیس سال پہلے بطور مدیر اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''میری پوری عمر اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے..... میں نے اتنے تجربات کئے ہیں اور مجھے اتنے مسائل سے گزرنا پڑا ہے کہ اگر انہیں بیان کروں تو ایک کتاب بن جائے۔''

ادبی رسالوں کی تعداد اشاعت کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بعض رسالوں کا سرکولیشن اتنا کم ہے کہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، تین چار ہزار کی تعداد میں چھپنے والے رسالے مشکل سے ایک دو ہی ہوں گے، ادبی رسائل کے قارئین میں بڑی تعداد ادیبوں اور شاعروں کی ہوتی ہے۔''

محمد یوسف ٹینگ مدیر ''شیرازہ'' سری نگر نے لکھا تھا:

''اردو رسائل خریدنے کے لئے بہت کم لوگ مائل ہوتے ہیں، جب مدیر کو معلوم ہو کہ اس کا رسالہ صرف چند مفت خوروں کے پاس جاتا ہے تو مایوس ہو کر اس کو محض رسماً جاری رکھتا ہے۔''

آج سے تیس سال پہلے ظ، انصاری نے لکھا تھا کہ اردو میں بعض رسالے، (ان میں ڈائجسٹ بھی شامل ہیں)، پچاس ہزار سے زیادہ اشاعت رکھتے ہیں، کئی روزنامے بھی منافع سے چل رہے ہیں۔

بنگالی، ملیالم اور تامل زبانوں میں شائع ہونے والے کئی رسائل لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں، ان زبانوں کی کتابوں کی طرح رسائل اور جرائد میں بھی متنوع موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں، جو ان کے قارئین کے بلند ذوق کی عکاسی کرتے ہیں، ان زبانوں کے رسائل اور کتابوں کے ناشر اشتہارات پر بھی اچھی رقم صرف کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے خریداری بڑھتی ہے۔

اردو رسالے کے ایک مدیر ف۔ س۔ اعجاز نے چند سال پہلے لکھا تھا، ''اردو کے برعکس شمالی اور جنوبی ہند کی دیگر زبانوں کے قارئین میں متنوع مزاج کی تحریریں قبول کرنے کا رجحان زیادہ صحت مند نظر آتا ہے، اردو قارئین کو عموماً تجربہ پسند نہیں، اس لئے مدیر بھی اپنے رسالے میں تجربہ نہ کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔''

تحریر کے مدیر مالک رام نے ایک نکتے کی بات کہی تھی:

''سب سے پہلی مشکل تو یہی ہے کہ (اردو میں) تحقیقی اور علمی مضمون لکھنے والے نہیں ملتے، میں نے پہلے دن ایک اصول بنایا تھا کہ مضمون ہر کسی سے طلب نہیں کروں گا مجھے معلوم تھا کہ اگر کسی صاحب نے میری درخواست پر مضمون لکھا اور وہ ہمارے معیار سے کم تر ہو تو دشواری پیدا ہوگی، نہ اسے چھاپ سکوں گا اور نہ اسے واپس کرنے کا موقع رہے گا..... لہٰذا میں نے محض ان اصحاب سے مضمون کی درخواست کی تھی، جن کی اہلیت اور علمی روایت کا مجھے علم اور یقین تھا۔''

اعجاز صدیقی تخلیقات سے متعلق رقم طراز ہیں:

''معتبر اہل قلم کی تخلیقات کے علاوہ اسے جو مواد حاصل ہوتا ہے وہ نوے فیصد غیر معیاری ہوتا ہے۔''

عابد سہیل لکھتے ہیں:

''تخلیقات میں ایک آدھ قدر اول کی ہوتی ہے، باقی دوسرے اور تیسرے درجے کی، اور ان کی آمیزش سے ایک ایسا معجون مرکب تیار ہو جاتا ہے، جس میں کچھ پرانے اور مشہور نام ہوتے ہیں، کچھ نئے لیکن مشہور، کچھ بالکل نئے..... کچھ کھوٹا کچھ کھرا۔ اور تازہ شمارہ تیار ہو گیا۔!''

عابد سہیل نے یہ بھی رونا رویا ہے کہ ایک ادبی رسالے کے مدیر کو مسودوں کے مطالعے سے لے کر ڈاک میں بھیجنے کا کام تک دیکھنا اور کرنا پڑتا ہے، ٹینگ صاحب اپنے مسائل یوں بیان کرتے ہیں:

''مدیر کو نہ صرف اپنے قارئین کو اپنے ذوق نظر کے قریب لانے کی سعی کرنا پڑتی ہے بلکہ ان کا مذاق اور جمالیاتی حس خود اسے بھی متاثر کرتی ہے..... مدیر کے لئے آزمائش کا موقع وہ ہوتا ہے جب اس کی ذاتی پسند عام ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ اختیار کر لے۔''

آج ایسے بھی رسائل کے مدیر ہیں، جو تخلیق چھپنے پر قلم کار کا معاوضہ دینا تو درکنار، اسے متعلقہ پرچے کی اعزازی کاپی بھی نہیں بھیجتے ہیں۔

دہلی میں کئی رسائل کے مالکان نے پاکستانی رسائل اور ڈائجسٹوں سے کہانیاں اور تخلیقات چرا کر چھاپنا تک ایک منافع بخش کاروبار بنا لیا ہے۔

صرف اردو اور دوسری زبانوں کے رسائل ہی بند نہیں ہوتے۔ Author میں میں نے پڑھا کہ ۱۸۸۴ء میں سوسائٹی آف آتھر کے قیام کے بعد ۱۹۲۲ء تک ۲۷ افسانوی رسائل اور ۱۳ دوسرے رسائل کا اجراء ہوا لیکن سوسائٹی کی سو سالہ سالگرہ تک سارے بند ہو گئے۔ ☆☆☆

.........بقیہ عقیقہ سنت ہے.........

عبداللہ بن بریدہؓ فرماتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے زمانے میں بچے کے عقیقہ میں بکری ذبح کر کے اس کا خون بچے کے سر پر لگاتے تھے اب اسلام کے بعد ہم بکری ذبح کرتے ہیں، بچے کے سر کا بال اتروا کر، خون کی جگہ زعفران ملتے ہیں۔

عقیقہ کی دعوت

عقیقہ کے بعد دعوت کرنا ضروری نہیں ہے، اور نہ کسی تقریب کی ترتیب فرض کی گئی ہے اگر گنجائش ہے تو اپنے دوست واحباب، خویش و اقارب کو بلا سکتے ہیں، ورنہ احباب میں گوشت تقسیم کر دیا جائے، جس طرح قربانی کے گوشت کو تقسیم کیا جاتا ہے گھر والوں کو کھانا شرعاً جائز ہے اور دعوت کا اہتمام مستحب ہے۔

حضرت معاویہ بن قرۃؓ نے فرمایا کہ جب میرے بیٹے) ایاس کی ولادت ہوئی تو میں نے عقیقہ کیا اور صحابہ کرام کی ایک جماعت کو دعوت دی وہ حضرات تشریف لائے، کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے بچے کے لئے برکت کی دعا کی، میں نے عرض کیا آپ لوگوں نے دعا کی اللہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں میں برکت دے، البتہ میں دعا کرتا ہوں آپ لوگ آمین کہیں، میں نے بچے کے ذہن و عقل و فرزانگی کے لئے دعا کی، تو آج میں اس دعا کی برکت پاتا ہوں (ادب المفرد/۱۲۵۵)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کی دعوت مشروع ہے اور جب دعوت دی جائے تو قبول کرنا چاہئے، خواہ شادی کا موقع ہو یا خوشی کا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إذا دعا احدكم أخاه فليجب عرسا كان اور نحوه (ادب المفرد/۱۲۵۳)

جب تمہیں کوئی شادی یا خوشی کے موقع پر دعوت دے تو ضرور قبول کرو۔

❁❁❁

احکام ومسائل

فقہی سوال وجواب

(مولانا) مفتی محمد طارق ندوی

سوال: مسجد کی ضروریات پر صرف کرنے کے لئے جو زمین وقف کی گئی ہو اسے بیچ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: مذکورہ زمین کی بیع ناجائز ہے وقف شدہ زمین کو بیچ نہیں سکتے ہیں۔

سوال: بینک سے سودی قرض لے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں، سود لینے اور دینے والے پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے "عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء" (مسلم، مشکوۃ شریف)

سوال: اکثر کسان کاشت کے وقت بیج دیتے ہیں اور ایک کوئنٹل کے بدلے ڈیڑھ کوئنٹل کھیت کاٹنے کے بعد لیتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟

جواب: یہ سود ہے ناجائز ہے۔

سوال: وہ کون سی مجبوری ہے جس کے تحت سودی قرض لینا جائز ہو جائے گا؟

جواب: ناقابل برداشت مجبوری کے تحت سودی قرض لینے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

سوال: غیر ممالک سے پاؤنڈ کی شکل میں ڈرافٹ آتا ہے اس کا گورنمنٹ آف انڈیا نے جو بھاؤ مقرر کیا ہے اس سے بڑھا کر تاجروں سے اس کا بدل لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کمی بیشی سے تبادلہ کرنا درست ہے۔

سوال: بدن کے جن حصوں کا نماز میں چھپانا فرض ہے ان میں کسی کا چوتھائی حصہ اتنی دیر تک کھلا رہے جتنی دیر میں تین بار سبحان اللہ کہا جاسکے یا اس حال میں ایک رکن ادا کرلیا جائے تو کیا نماز درست ہو جائے گی؟

جواب: بدن کے جن حصوں کا نماز میں چھپانا فرض ہے ان میں سے کسی کا چوتھائی حصہ اتنی دیر تک کھلا رہے جتنی دیر میں تین بار سبحان اللہ کہا جاسکے یا اس حال میں ایک رکن ادا کرلیا جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

سوال: بعض حضرات نماز پڑھتے وقت چادر کو سلیقے سے نہیں لپیٹتے ہیں بلکہ چادر بے سلیقہ لٹکتی رہتی ہے یہ عمل کیسا ہے؟

جواب: نماز پڑھتے وقت چادر وغیرہ کا لٹکتے رہنا مکروہ ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص نماز میں اپنا کپڑا لٹکائے اور یہ کہ اپنا منہ چھپائے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

سوال: حضرت حسینؓ کے ساتھ علیہ السلام کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: علیہ السلام کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے رضی اللہ عنہم کا لفظ صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے، اب اگر کوئی غیر صحابہ کے ساتھ رضی اللہ عنہم کا لفظ استعمال کرے تو اگرچہ لفظی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں مگر چونکہ یہ اصطلاح بن چکی ہے اس لیے غیر مناسب ہے، اسی بناء پر حضرت حسینؓ کے لئے بھی رضی اللہ عنہ کہنا چاہئے۔

سوال: استاد یا پیر سے عورت کو پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب: اسلام میں عورتوں کو نامحرم مردوں سے جن سے نکاح درست ہو سکتا ہے، پردہ کرنا ضروری ہے، لہٰذا نامحرم استاذ ہو یا پیر سب سے پردہ کرنا چاہئے۔

سوال: ایک شخص پر ظلم کیا جارہا ہے کیا وہ اس سے بچنے کے لئے رشوت دے سکتا ہے؟

جواب: ہاں، بصورت مسئولہ میں رشوت دے سکتا ہے، فتاوی عالمگیریہ میں ہے "اذا دفع الرشوۃ لدفع الجور عن نفسہ أو أحد من أهل بیتہ لم یأثم"

(جلد پنجم)

سوال: مسجد میں جوتے لے جانا درست ہے یا نہیں؟

جواب: اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں جوتے رکھے جاسکتے ہوں، تو ایسی صورت میں جوتے لے جانا مناسب نہیں اور کوئی جگہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس کا لحاظ ضروری ہے، کہ جوتوں کی گندگی سے مسجد ملوث نہ ہو جائے۔

سوال: کیا اسلام بھی شیخ اور پٹھان کی طرح کسی قوم اور ذات برادری کا نام ہے، کہ شیخ برادری میں پیدا ہونے والا شیخ، اور پٹھان برادری میں پیدا ہونے والا پٹھان ہوتا ہے، اور اسے شیخ یا پٹھان ہونے کے لئے کچھ کرنا نہیں پڑتا ہے، کیا اسی طرح کسی مسلمان خاندان میں پیدا ہونے والا خود مسلمان ہوگا، اسے مسلمان ہونے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

جواب: اسلام کسی قوم اور ذات برادری کا نام نہیں ہے، کہ اس میں پیدا ہونے والا ہر آدمی آپ سے آپ مسلمان ہو، اور اسے مسلمان بننے کے لئے کچھ کرنا نہ پڑے، بلکہ اسلام نام ہے اس دین کا اور اس طریقہ پر چلنے کا جو اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں بتلایا گیا ہے، جو شخص اس دین کو اختیار کرے، اور اس کے طریقے پر چلے وہی اصلی مسلمان ہے، اور جو لوگ نہ اس دین کو جانتے ہوں اور نہ اس پر چلتے ہوں، وہ اصلی مسلمان نہیں۔

سوال: کوئی شخص کب مسلمان ہوتا ہے؟

جواب: جب کوئی کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں کو دل سے مانے اور زبان سے اقرار کرلے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، مگر شرط ہے کہ اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا جو اقرار ہے اس کو سمجھ کر مانا اور قبول کیا ہو، اگر کسی شخص نے توحید و رسالت کو بالکل نہ سمجھا ہو اور بغیر معنی و مطلب سمجھے اس نے یہ کلمہ پڑھ لیا ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان نہ ہوگا۔

☆☆☆

کتاب نما

"قرآن کریم: تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ" اور "تاریخ تدوین سیرت"

(حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں مولانا عبداللہ عباس ندوی کی دو مہتم بالشان کتابوں کی رسم اجراء)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

۷ستمبر ۲۰۰۳ء کی شام وہ شام ہمایونی تھی، اور اس دن کا جشن وہ جشن بہاراں تھا جس میں دو خوبصورت کتابوں کی رسم اجراء تھی، دو روح پرور موضوعات کا قران السعدین تھا، قرآن اور سیرت نبوی، زندگی میں ان ہی دونوں کی حسن آمیزش کا نام سبیل السلام ہے جو حیات انسانی کے لئے سب سے بڑا انعام ہے، یہ دونوں موضوعات سدا بہار ہیں ان دونوں کتابوں کے اور ان دونوں سدا بہار اور گلشن بکنار موضوعات کے مصنف بزرگ و عظیم، صاحب فکر مستقیم، ندوۃ العلماء کے معتد تعلیم اور مہبط وحی مکہ معظمہ میں مقیم، مکہ مکرمہ کی ام القری یونیورسٹی کے معلم قدیم حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی ہیں، قرآن وسیرت کے موضوعات پر ان کے خامہ عنبر شامہ نے اتنے پھول کھلائے ہیں اور گلوں میں اتنے رنگ بھر دئے ہیں کہ ان کی نگارشات پر دامان باغباں اور کف گلفروش ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے، قرآنی موضوعات پر ان کی عربی اردو اور انگریزی کتابوں کو دیکھئے تو ایک طویل فہرست نظر آتی ہے، ایک کتاب عربی میں قرآن مجید کے ترجموں پر ہے ایک کتاب تفسیری انحرافات پر ہے، ایک بہت ضخیم قاموس معجم انگریزی زبان میں قرآنی الفاظ پر ہے، اسی طرح ان کی ایک کتاب (Learn the Language of Quran) ہے اور کئی کتابیں ہیں، ندوۃ العلماء کے بعد اعلیٰ تعلیم انہوں نے یورپ میں لیڈس یونیورسٹی میں حاصل کی اور اقبال کی زبان میں ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

لیکن دارالعلوم سبیل السلام میں قرآن کریم کے اعجاز کے موضوع پر مولانا کی جس کتاب کی رسم اجراء انجام پائی اس کی حیثیت موتیوں کے ہار واسطۃ العقد کی ہے، خوش رنگ اور خوش نما پھولوں کے درمیان گل سرسبد کی ہے یا ستاروں کے جھرمٹ میں چاندکی ہے، اس کی حیثیت صرف یہ نہیں ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی کے بافیض قلم گوہر رقم کی اہم ترین کتاب ہے بلکہ اس کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اردو زبان کے ذخیرہ میں یہ بے حد بیش قیمت اضافہ ہے عربی زبان میں اس بے حد اہم موضوع پر کتابیں موجود ہیں لیکن اردو زبان کا دامن اپنی گراں مائیگی اور وسعت کے باوصف اور بچھ ترجموں کے باوجود اس موضوع پر باقاعدہ اور باضابطہ تصنیف سے خالی تھا، اب وہ خلا پر ہوگیا ہے جو اردو زبان کی ابتدائے آفرینش سے آج تک چلا آرہا تھا۔

یہ کتاب اگرچہ قرآن کے اعجاز کے موضوع پر ہے اور قرآن کی زبان عربی مبین ہے لیکن اس کتاب کی ایک بے حد اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی بے حد مفید ہے جو عربی زبان سے واقف نہیں اور ان کے لئے بھی نفع بخش ہے جو مدارس عربیہ کے طلباء ہیں یا اساتذہ ہیں، اس کتاب میں اقسام القرآن اور امثال القرآن اور دوسرے علوم قرآنی پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے، جو لوگ دل سے قرآن مجید کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کے معجزہ ہونے پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر علم وتحقیق کی روشنی میں علی وجہ البصیرۃ قرآن کے اعجاز کے قائل ہو جائیں گے، اور معجزہ ہونے کی دلیلیں عقل کی گرفت میں آجائیں گی، سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والا قرآن مجید سے تعلق میں اضافہ محسوس کرے گا، قرآن کی تلاوت میں اس کا دل لگنے لگے گا، کتاب کی کامیابی اور مصنف کتاب کی خوشی اور خوش بختی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کو اپنے رب کی کتاب سے مربوط کردے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس سعادت میں مصنف کتاب کے ساتھ مولانا رضوان القاسمی بھی شریک وسہیم ہو چکے ہیں جنہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اور بڑے انتظام کے ساتھ یہ کتاب شائع کی اور اس کے لئے جشن منعقد کیا، مولانا عبداللہ عباس ندوی کے قلم کی حسن کاری کے تذکرہ کا یہ محل نہیں، جہاں قرآن کے حسن و جمال کی جلوہ آرائیوں کا موضوع ہو وہاں ایک بندہ کے حسن قلم کا تذکرہ کیسے ممکن ہے لیکن اس بات کو کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ مولانا کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ ان کی تصنیف روح پرور اور نشاط انگیز ہوتی ہے اور ہر قسم کے دعویٰ سے اور تنقید اور تنقیص سے خالی ہوتی ہے، انہوں نے اپنی نگارشات میں ادعائی انداز اور ہیچمدان دیگرے نیست کا اسلوب اور لن ترانیوں کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا، اخلاص کے ساتھ قرآن اور سیرت پر کام کرنے کی یہ برکتیں ہیں جو انہیں حاصل ہوئی ہیں، اور اس کا سب سے بڑا فائدہ انہیں اس وقت ملنے والا ہے جب وہ قرآن مجید کے نازل کرنے والے اور اپنے رسول کو مبعوث کرنے والے کے پاس جائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کی کتابوں کی برکتوں کا کچھ حصہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی عطا فرمائے، آمین، اس کی قیمت دو سو روپے ہے۔

مولانا کی کتاب "قرآن تاریخ انسانیت کا

سب سے بڑا معجزہ" کے ساتھ مولانا کی دوسری کتاب جس کے اجراء اور رونمائی کی رسم انجام دی گئی، وہ ہے "تاریخ تدوین سیرت"۔

تعلیم یافتہ اردو داں حلقہ اس سے واقف ہے کہ اردو زبان کا دامن سیرت پر کتابوں سے مالا مال ہے، پہلے سرسید نے خطبات احمدیہ تصنیف کی اور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دیا، اس کے بعد تین سلیمان سامنے آئے شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی سلیمان منصور پوری اور سید سلیمان ندوی۔ تینوں نے میدان سیرت میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں بعض اہل علم ان تینوں سلیمانوں کو ملا کر "سلامنہ ثلاثہ" کہتے ہیں، مولانا عبداللہ عباس ندوی کو اول الذکر سے خانوادہ نسب وقرابت کی اور موخر الذکر سے خانوادہ علم ومعرفت کی نسبت حاصل ہے، مولانا کے خانوادہ نسب ووطن اور خانوادہ علم ومعرفت دونوں کے ایک مشترک فرزند جلیل شاہ جعفر پھلواروی ندوی ہیں، جنہوں نے اولاً تذکرہ جمیل کے نام سے اور پھر پیغمبر انسانیت کے نام سے منفرد طرز کی سیرت پر کتابیں لکھی پھر مولانا عبداللہ عباس ندوی کے استاذ اور محترم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک سے زیادہ کتابیں سیرت پر موجود ہیں اور حقیقت یہ کہ ہے حضرت مولانا علی میاں کی تمام تصنیفات عشق رسول ﷺ کے عطر سے معطر اور سیرت نبوی کے نور سے منور ہیں۔

رواں ہو برگ گل تر سے جیسے بوئے شمیم

مولانا عبداللہ عباس ندوی کی شخصیت بھی شیشہ محدب کا وہ آتشیں نقطہ ہے جو بے شمار کرنوں کا نقطہ اتصال ہے، سیرت نبویؐ اور اس کے متعلقات پر ان کی کتابیں تسلسل کے ساتھ سامنے آتی رہی ہیں، اور اس موضوع پر کام سے ان کا قلم کبھی تھکتا نہیں، بقول شاعر:

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام

ان کا قلم عشرت منزل سے ناواقف، مسلسل رواں رہتا ہے۔ ردائے رحمت، عربی زبان کی نعتیہ شاعری، پیغمبر اخلاق و انسانیت سے لے کر تاریخ تدوین سیرت تک ان کا قلم مسلسل چمن سیرت میں خوش رنگ وخوشبودار پھول کھلاتا رہا ہے، اردو میں تاریخ تدوین قرآنی تفسیر لکھی گئی تھی، تاریخ تدوین حدیث موجود تھی، تاریخ تدوین فقہ پر بھی کام ہو چکا تھا لیکن تاریخ تدوین سیرت پر باقاعدہ کتاب پہلے موجود نہ تھی۔

زیر تعارف کتاب میں عرب اور علم تاریخ کے نام سے فاضلانہ مقالہ ہے اس مقالہ میں خلافت راشدہ کے بعد سے سیرت ومغازی پر تمام کاموں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، سیرت نبوی کے مآخذ ومصادر پر عالمانہ روشنی ڈالی گئی ہے، ہر کتاب کی علمی اور تاریخی حیثیت متعین کی گئی ہے، مضامین سیرت کے عنوان کے تحت سیرت پر بے شمار کتابوں کی فہرست دی گئی ہے ان علماء کا نام دیا گیا ہے جنہوں نے اس فن کو نکھارا سنوارا، سیرت پر کتابوں کا غیر منتہی سلسلہ ہے ہر کتاب کا رنگ جداگانہ بقول شاعر

نیا ہے لیجئے جب نام ان کا
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

قرآن مجید اور سیرت طیبہ کے موضوع پر ان دو کتابوں کی تصنیف کے بعد جن کے اجراء کی رسم انجام پائی مولانا عبداللہ عباس ندوی کو زیر لب یہ شعر پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے

حاصل عمر نثارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس کتاب کا باب سوم مضامین سیرت کا خصوصی مطالعہ حرز جاں بنائے لئے جانے کے لائق ہے، کتاب پر حضرت مولانا محمد رابع ندوی مدظلہ العالی کا مقدمہ ہے، آخر میں مولانا رضوان القاسمی کے قلم سے سیرت پر اردو زبان میں کتابوں کی قیمتی بیلو گرافی ہے، کتاب کی قیمت سو روپے ہے۔

ان دونوں کتابوں کی رسم اجراء سے پہلے مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ نے بخاری شریف کی آخری حدیث کا طلبہ اور اساتذہ کے سامنے درس دیا، کتابوں کی رسم اجراء کی یادگار محفل میں مولانا حمید الدین عاقل حسامی، مولانا سلیمان سکندر، جناب محترم عبدالرحیم قریشی، جناب عبداللہ مسقطی، شہر کے دینی مدارس کے اساتذہ اور اہل قلم اور دانش ورجمع تھے، یہ دونوں کتابیں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے شائع کی ہیں، کتابت وطباعت نہایت اعلیٰ اور دیدہ زیب ہے، اور ہر صاحب ذوق شخص کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس موقعہ پر علامہ ابن قیم کی کتاب کا اردو ترجمہ مولانا خورشید انور ندوی استاذ دارالعلوم سبیل السلام کا کیا ہوا "جنت اور اہل جنت" کے نام سے شائع ہوا، اس کتاب کی رسم اجراء بھی اسی موقعہ پر انجام پائی، یہ کتاب جنت کا شوق پیدا کرنے کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتابیں جلد مکتبہ ندویہ، نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور دوسرے مشہور مکتبوں میں بھی دستیاب ہوں گی۔

●●●

مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کو صدمہ

مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی والدہ ماجدہ اتوار ۱۴ ستمبر ۲۰۰۳ء کو اپنے وطن مالوف ململ میں انتقال فرما گئیں، ان کی عمر ۸۵ برس تھی، مرحومہ بظاہر ٹھیک تھیں مگر وقت موعود آ گیا اور انہوں نے بعد نماز فجر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ادارہ مولانا نذر الحفیظ ندوی اور ان کے بھائی جناب قمر الحفیظ ندوی نیز مرحومہ کے جملہ پس ماندگان کے ساتھ اظہار تعزیت کرتا ہے اور مرحومہ کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لئے اللہ کے حضور بدست دعا ہے۔

تعارف وتبصرہ

کتابوں کی دنیا

مولانا محمود حسن حسنی ندوی

نام کتاب : آئینہ نماز
تالیف : مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مدنی
شائع کردہ : فیض پبلیشرز، رحمت نگر، رنگ روڈ، دوبگا، لکھنؤ۔

معروف عالم دین مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کی یہ کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے کتاب میں طہارت کے اہم اور ضروری مسائل کے بیان، اذان و اقامت کی تفصیلات کے ساتھ نیت نماز سے لے کر جو کہ شرط صلوٰۃ ہے، ترکیب، فرائض، واجبات، سنن مستحبات اور آداب کی معلومات کا آسان اور دلنشین اسلوب میں ذکر ہے، فرض نمازوں کے علاوہ تقرب الٰہی کے لئے، دیگر اور جو نمازیں مثلاً عیدین، چاشت، تہجد، اوابین، توبہ، استخارہ، کسوف وخسوف، استسقاء، اور صلواۃ التسبیح وغیرہ کی بھی ضروری معلومات فراہم کر دی گئی ہیں، آخر میں زکوٰۃ حج، روزہ کے احکامات ومسائل بھی دیئے گئے ہیں، جن کے ذیل میں، اعتکاف، صدقہ فطر، قربانی، اور زیارت مدینہ طیبہ کے تعلق سے تحریر بھی شامل ہے، قیمت -/25 روپے ہے، اور قاری محمد عثمان صاحب قریشی کی کوششوں سے یہ کتاب طبع ہوئی ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

☆☆☆

نام کتاب : مقبول دعائیں
تالیف : مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب دام ظلہ
شائع کردہ : فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ پنودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔
صفحات : ۳۱۰، قیمت/۸۶ روپے۔

داعی الی اللہ مولانا عبدالکریم پاریکھ ہندوستان کی مشہور شخصیت ہیں، دعاؤں کے تعلق سے ان کی یہ تازہ تصنیف قرآن حکیم اور حدیث نبوی شریف سے ماخوذ دعاؤں پر مشتمل ہے، جس کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہے، جس میں وہ دعا سکھلائی گئی ہے جو تمام دعاؤں اور تمناؤں پر حاوی اور جامع ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی خاص دعاؤں سے بھی یہ کتاب مزین ہے، مدراس کے بھوپالی عالم اور وہاں مسجد پیریامیٹ کے امام وخطیب قاری محمد قاسم صاحب دام مجدہ کا مقدمہ ہے جس میں حقیقت دعا و اجابت دعا کا مغز آ گیا ہے، طباعت اعلیٰ ہے۔ ☆☆

نام کتاب : رہنمائے طریقت
تالیف : قاری مسعود عزیزی ندوی
شائع کردہ : راز احیاء فکر اسلامی، مظفر آباد، سہارنپور، یوپی

۵۰ صفحات کا یہ رسالہ سلوک ومعرفت کے مہمات کے بیان میں ہے، صحت عقیدہ، اتباع سنت، اور پھر اپنی ذات کا محاسبہ، اور دوسروں کے سلسلہ میں عذر وتاویل، مجاہدہ نفس، مراقبۂ موت، اور زہد وتوکل، قناعت، تسلم ورضا، صبر وشکر، غنائیت، جیسی صفات سے متصف ہو کر حرص وطمع، کذب وخیبت، ریا وحسد، بغض و کبر، حب جاہ وحب مال وغیرہ رذائل سے نفس کو پاک و صاف کرنا، ایک سالک معرفت وطریقت کا جذبہ وعمل ہوتا ہے، ان کے ضروری مفہوم کو کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے، اس کے ساتھ اخلاق وصفات سے آراستہ و پیراستہ ہونے کی علامت اور سلاسل اربعہ کہ جن کے اصول پر چل کر ایک سالک کمال معرفت کو پہونچتا ہے کہ خصوصیات وتعلیمات بھی اس جامع رسالہ مین بیان کر دی گئی ہیں، اور آخر میں مشائخ وقت کی فہرست بھی دے دی گئی ہے، یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : لطائف محمود
تالیف : مفتی محمد فاروق صاحب میرٹھی
شائع کردہ : کتب خانہ نعیمیہ متصل مظاہر علوم سہارنپور

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی شخصیت علمی ودینی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ تھے، دارالعلوم دیوبند ہو یا مظاہر العلوم دونوں مرکزی اداروں کے علماء، آپ کے تلامذہ ومشترشدین ہیں، جنوبی افریقہ میں آپ کی ذات والا برکات سے نفع زیادہ پہونچا، اور اسی کے آغوش میں آپ نے آخری سانس لی، اس کتاب میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے یکے از مسترشدین مفتی محمد فاروق صاحب زید مجدہ نے اپنے شیخ ومرشد کے وہ احوال زریں یکجا کئے ہیں، کہ جن میں ہلکا مزاح ہے، اور وہ نصیحت آموز بھی ہیں، صفحات ۷۲ ہیں۔

☆☆☆

نام کتاب : قرآن مجید پر اعتراضات کی حقیقت (اردو، ہندی)
مؤلف : جناب نسیم غازی صاحب
شائع کردہ : مدھر سندیش سنگم، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

قرآن مجید پر عموماً جہاد اور جنگ وقتال، مال غنیمت، مشرکین وکفار مذہبی آزادی پر روک، بت پرستی، اخروی نجات کے متعلق سے اعتراضات کئے جاتے ہیں، مکرمی جناب نسیم غازی صاحب نے ایک سنجیدہ اور تعلیم یافتہ غیر مسلم کو ایک گفتگو میں ان اعتراضات کے جو خود ان صاحبنے کئے تھے جواب دیکر مطمئن کیا تھا، جس کے بعد وہ صاحب اس فکر کے ساتھ گئے کہ یہ سارے اعتراضات بے بنیاد اور گمراہ کن ہیں، اسی گفتگو کی روشنی میں یہ کتاب تیار کی گئی ہے، اس کے ملنے کا پتہ مرکزی مکتبۂ اسلامی پبلشرز ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ہے، اور قیمت ۴۸ صفحات کے اس رسالہ کی صرف ۱۵ روپے ہے۔ ☆☆☆

جنت اور اہل جنت
از: علامہ ابن قیم الجوزیہؒ
مترجم: خورشید انور ندوی مدنی (قیمت -/100)
ملنے کا پتہ:
(۱) دارالعلوم سبیل السلام مدینۃ العلم حیدرآباد
(۲) مکتبہ ندویہ، ندوہ، لکھنؤ ۷

Haj-2004

(Flight from Lucknow)

Haj-Rs. 70,000/-
Umrah-Rs.28,000/-

Includes:

- Visa
- Lucknow-Jeddah-Lucknow economy class air ticket
- Medical Certificate
- Accommodation (Mecca & Medina)(500 meters from the periphery of the Haram.
- All Transport (Jeddah-Mecca-Medina-Jaddah) (Mecca -Mina-Arafat-Mina-Mecca)
- Ziarat of holy places.
- Complete guidance from Lucknow for performing Haj

Not included:

- Meals & Qurbani

Requirements:

- Passport along with 12 coloured passport size photos
- Rs. 20,000/- as an advance for registration and balance will be deposited in the month of Ramazan

For details contact

Travelup

58,Hazratganj, Lucknow-226001
Phone :0522-2274712 Teletax: 0091-522-2266910
E-mail: travelup@rediffmail.com
Mobile: 9415086659

تعمیر حیات • زرتعاون

- فی شمارہ -/Rs. 7 سالانہ زرتعاون -/Rs.150
- ششماہی -/Rs.80
- حاتمی زرتعاون برائے مدارس، لائبریری وغیرہ -/Rs.130
- غیر ملکی فضائی ڈاک سے -/Rs.1500
- پاکستان کے لئے -/Rs. 800
- بنگلہ دیش کے لئے -/Rs.800
- غیر ملکی بحری ڈاک -/Rs.900

نرخ اشتہار

- نرخ اشتہار رنگین صفحہ (پشت پر) -/Rs. 50 فی سینٹی میٹر فی کالم
- نرخ اشتہار (اندرونی صفحہ) -/Rs.40 فی سینٹی میٹر فی کالم
- اشتہار کی نصف رقم پیشگی جمع کرنا ضروری ہے۔

شرائط ایجنسی

- پانچ پرچوں سے کم کی ایجنسی جاری نہ ہوگی۔
- فی کاپی -/Rs.15 بطور زرضمانت پیشگی ادا کرنا ہوگا۔

کمیشن

۵ تا ۲۰ کاپی	25%	۲۱ تا ۵۰ ؍؍	30%
۵۱ تا ۱۰۰ ؍؍	35%	۱۰۰ سے زائد	40%

ممبئی کے قارئین "تعمیر حیات" سے

ممبئی کے قارئین "تعمیر حیات" سے گذارش ہے کہ "تعمیر حیات" کے سلسلہ میں رقم جمع کرنے یا خریدار بننے کے سلسلہ میں ذیل کے پتہ پر رابطہ قائم کریں، وہاں ان کو رقم جمع کرنے کی رسید مل جائے گی۔

ALAUDDIN TEA

Tea Merchants

44, Haji Building, S.V. Patel Road,
Null Bazar, Mumbai 400 003
Tele: Add CUPKETTLE Tel.: 3460220, 3468708
Tel. (R) 3095852

۱۲ نمبر اور ۱۲x۷ کی اسپیشل چائے استعمال کیجئے

محض تمنا کافی نہیں

امین الدین شجاع الدین

۲۱ر ستمبر کو ندوہ کے مہمان خانہ میں الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ایک معروف شخصیت نے جناب ناظم ندوۃ العلماء سے ملاقات کی، مہمان کا تعلق اکثریتی طبقہ سے ہے، "پیام انسانیت" کے پلیٹ فارم سے کی جانے والی کوششوں کا تذکرہ آیا، بانی تحریک پیام انسانیت حضرت مولانا علی میاں کا ذکر خیر بھی ہوا اور اس تحریک کے پس پشت ان کی دردمندی و دلسوزی کی باتیں بھی ہوئیں، یہ حضرات محو گفتگو تھے اور راقم الحروف کو یہ واقعہ یاد آ رہا تھا جس کے راوی مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری ہیں۔ کلکتہ کے ایک جلسہ میں حضرت مولانا علی میاں مہمان تھے اور ازہری صاحب میزبان —— میزبان نے اپنے معزز مہمان کا تعارف کرایا جلسہ کے بعد ازہری صاحب سے مولانا نے کہا کہ آپ نہ جانے کس کس حیثیت اور عنوان سے میرا تعارف کرا رہے تھے، لیکن میں اس دوران یہ سوچ رہا تھا کہ آپ بحیثیت 'انسان' میرا تعارف کراتے ہیں یا نہیں —— یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ایک شخص کا انسان ہونا اس کا سب سے بڑا وصف اور اس میں انسانیت کا پایا جانا اس کی حقیقی پہچان تھی، غالباً یہی وہ فکر تھی کہ جس کی بدولت مولانا نے جب دیکھا کہ انسان اپنی اس بنیادی 'پہچان' سے بیگانہ ہو رہا ہے اور نتیجہ میں اس کے اندر کا حیوان جاگ رہا ہے تو وہ بے چین ہو گئے اور اپنی تمام تر علمی و تصنیفی مصروفیات کے باوجود (جو کہ یکسوئی کی طالب ہوا کرتی ہیں) تحریکی نوعیت کی سرگرمیوں میں بھی مشغول ہوئے —— آج الحمدللہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک پیام انسانیت کی ضرورت نکھر کر سامنے آ رہی ہے —— تحریک پیام انسانیت کے لئے اس ملک کی سرزمین زرخیز ہے اس لئے کہ یہاں کا خمیر باہمی محبت و یگانگت سے اٹھا ہے، دوران گفتگو جناب ناظم ندوۃ العلماء نے اس کی ایک مثال دی کہ ابھی ہم رائے بریلی سے آ رہے ہیں راستہ میں مغرب کی نماز ایک مسجد میں ادا کی گئی معلوم ہوا کہ مسجد کا پڑوسی ایک غیر مسلم ہے اور مسجد کے کاموں میں اس کا تعاون بھی مسجد والوں کو حاصل رہا ہے اس نے نماز بعد ہم سے ملاقات بھی کی —— تو یہ ہے ہمارا اصل ہندوستانی معاشرہ اور ایسا ہے اس کا مزاج! —— باہمی محبت و رواداری کا مزاج! —— اس ملک کے باشندوں کی اکثریت امن پسند اور صلح پسند ہے اور شر پسندوں کی تعداد مٹھی بھر ہے —— البتہ فرق صرف یہ ہے کہ جو لوگ مٹھی بھر ہیں، وہ منصوبہ بند اور منظم ہیں اور اپنے مقصد میں سنجیدہ ہیں، جبکہ امن پسندوں کے پاس سنجیدہ منصوبہ بندی اور تنظیم کا فقدان ہے۔ یہ مٹھی بھر لوگ مٹھی کی طرح متحد ہیں اور امن پسند لوگ انگلیوں کی طرح علٰحدہ اور مختلف!

الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ اس شخصیت نے جناب ناظم ندوۃ العلماء سے ایک بات اور کہی کہ ہمارے پاس میڈیا ہے اور آپ کے پاس پیغام —— ہمارے آپ کے مابین ایک رابطہ ہونا چاہئے، آپ کا پیغام عوام تک پہونچے، اس کے لئے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے —— راقم الحروف کو خیال آیا کہ میڈیا اور اس جیسے وسائل تو معصوم ہوتے ہیں البتہ ان کا استعمال انہیں مفید یا مضر بنا دیتا ہے، مثلاً ایک چھری کی مثال لیجئے جو فی نفسہ بے ضرر ہے۔ اب یہ اس کے استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اس چھری سے سیب کاٹتا ہے یا کسی انسان کے گلے پر چھری پھیرتا ہے —— یہی مثال میڈیا کی ہے میڈیا فی نفسہ معصوم اور بے ضرر ہے البتہ منفی اور تخریبی ذہن رکھنے والوں نے اس کو اپنے کام میں لانے کے لئے جس تیزی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس 'معصوم' کو جس طرح مسموم بنا دیا، افسوس کہ اس سطح کی مستعدی ان افراد کی طرف سے دیکھنے میں نہیں آتی جو میڈیا کو مثبت اور تعمیری رخ دے سکتے ہیں، اس لحاظ سے میڈیا کے سلسلہ میں بھی اسی کمزوری اور کوتاہی کا احساس ہوتا ہے جس کا تذکرہ گزشتہ سطروں میں کیا گیا۔ میڈیا کی دنیا میں متعصب ذہن کی کارفرمائی اور اس جیسے دوسرے عوامل سے انکار مقصود نہیں مگر اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ "تخریب کے جنون" کے مقابلہ میں "تعمیر کے عشق" کا پہلو نسبتاً کمزور اور غیر منظم ضرور ہے۔

دوران گفتگو تیسری بات یہ سامنے آئی کہ ہندو مسلم قوموں کے مابین بہت سی بے بنیاد غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں —— واقعہ یہ ہے کہ ایسی ہی غلط فہمیوں کی بنیاد پر نفرت کی کاشت کرنے والوں کو غذا اور کھاد مہیا ہو رہی ہے البتہ اس کے ازالہ کے لئے کی جانے والی کوششوں کا تناسب بھی نفرت کا پرچار کرنے والی کوششوں کے مقابلہ میں کم اور کمزور معلوم ہوتا ہے۔

حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ایک طرف ببول کی کاشت نہایت منظم و منصوبہ بند طریقہ سے کی جا رہی ہے جب کہ گلاب کی کاشت کی کوششیں نسبتاً سست اور کمزور ہیں۔ جبکہ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں محض تمنا کافی نہیں بلکہ عمل ضروری ہے۔ فھل من مدکر

☆☆☆